فکرِ اقبال کا ترجمان

میرا پیام

(۱۷)

مدیر

پروفیسر عبدالحق

اقبال اکیڈمی (ہند) نئی دہلی

میرا پیام

جملہ حقوق محفوظ

ناشر : اقبال اکیڈمی (ہند)، نئی دہلی

اشاعت : ستمبر ۲۰۲۳ء

پریس : اصیلا پریس نئی دہلی

قیمت : سو روپیے

MERA PAYAM

Iqbal Academy (India)

Cisrs House, 14 Jangpura B.

Mathura Road, New Delhi

September 2023

ترتیب

ڈاکٹر سید ظفر محمود	حرفِ آغاز	۴
پروفیسر عبدالحق	عرضِ حال	۵
علامہ عبداللہ العمادی	کلیاتِ اقبال کا مقدمہ	۶
پروفیسر عتیق اللہ	پروفیسر عبدالحق سے ایک مکالمہ	۹
ڈاکٹر نسیم عباس لاہور	قرۃ العین حیدر کی نظر میں علامہ اقبال	۱۷
پروفیسر عبدالحق	فکرِ اقبال اور نسلِ نو	۲۵
پروفیسر توقیر احمد خان	اقبال کی نظم ''خضرِ راہ'' کی ضرورت	۴۲
ڈاکٹر شاہدہ پروین	علامہ اقبال کی نعتیہ شاعری	۴۸
ڈاکٹر نفیس حسن	خضرِ راہ کی بانگ درا	۵۷
عارف حسن خان	''بالِ جبریل'' کی غزلیات کا شعری آہنگ: ایک تجزیاتی مطالعہ	۶۴
ڈاکٹر سرفراز جاوید	خضرِ راہ کا منشور	۷۹
ڈاکٹر محمد شاہد خان	خضرِ راہ	۸۸
ابوذر انصاری	انتساب میں شعرِ اقبال کی معنی آفرینی	۹۱
ڈاکٹر اقبال قریشی	اقبال کے دینی تصورات	۱۰۳
حافظ محمد اختر مظاہری	دبستانِ نعت	۱۰۴

حرفِ آغاز

شکرِ رب ہے کہ میرا پیام کا سترہواں شمارہ قارئین کو نذر کر کے یک گونہ مسرت حاصل ہو رہی ہے۔اس کی اشاعت کے تقریباً دس برس ہونے کو ہیں۔ایک دہائی تک مسلسل اشاعت سے حیرت ہوتی ہے اور ادارے کی کارکردگی پر اطمینان بھی ہوتا ہے کہ ہم ہر طرح کی مشکلات سے گزرتے رہے مگر استقلال کے دامن سے دست بردار نہیں ہوئے۔اشاعت میں دیر سویر ہوتی رہی وہ بھی ادارے کی طرف سے نہیں۔مضامین کی دست یابی میں اہل قلم کے تعاون کی وجہ سے۔پھر بھی ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ وہ اپنے نگارشات سے ہمیں نوازتے رہے۔بزرگوں کے ساتھ نئی نسل کے قلم کاروں نے بھی ہمیں مایوس نہیں ہونے دیا۔ان کے ساتھ قارئین کا بھی ممنون ہوں ان کے مشوروں سے بہتر سے بہتر صورت گری کی طرف مائل ہیں۔رسالے کے قارئین میں متواتر اضافہ ایک خوش آئند امکان کا اشارہ دیتا ہے ادارہ اقبال کے شائقین کے لیے وقف ہے۔اور تمام دوستوں کا ادارے میں ہمہ وقت استقبال ہے۔اس شمارہ کے لیے بھی آپ کے تاثرات کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر سید ظفر محمود

عرضِ حال

جریدے کے تازہ شمارہ کی اشاعت پر فخر اور فرحت دونوں کا احساس ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ جب حالات سنگین ہوں تو حریفِ سنگ ہونا ہی پڑتا ہے۔ مشکلات کے مقابلے کے لیے تاب وتواں کی آزمایش کے ساتھ عزم واستقلال کی فولادی قوت درکار ہوتی ہے۔ جو فتح ونصرت کو سرخ رو کرتی ہے۔ جہاں یہ استقامت ہو کامرانی مقدر بن جاتی ہے۔ سفر مشکل ہو تو پاؤں کی دھمک سے ہزاروں چشمے نمودار ہوتے ہیں اور ریگِ رواں کی طرح ہم سفر ہوتے ہیں۔ اقبال فہمی کارِ نیک سہی مگر جان ودل کے حوصلے کی طلب گار بھی ہوتی ہے۔ حوصلے کی بشاشت سے رگِ سنگ میں لہو کی گردش تیز تر ہو جاتی ہے۔ ادارے کے یہی مشاہدات ہیں۔ جن میں اقبال کے حلقۂ یاراں کی ہمت افزائی سے جہانِ تازہ کی تخلیق کے لیے عزائم بیدار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ شمارہ اس کا مظہر ہے۔ تھوڑی تاخیر سہی لیکن ہماری کم کوشی اشاعت میں حائل نہ ہو سکی قارئین اور شائقین ہمہ وقت کمر بستہ رہنے کی عزیمت بخشتے رہتے ہیں۔ محسوس کرتا ہوں کہ میرا پیام کے حلقے میں شامل زیادہ بیدار اور بصیرت کے مالک ہیں۔ یہ فکرِ اقبال کا فیضان ہے۔ اس شمارے میں مولانا عمادی کا وہ مقدمہ بطور تبریک شامل کیا جا رہا ہے جو علامہ اقبال کی اجازت کے بغیر ۱۹۲۴ء میں اردو کلیات شائع ہوا تھا۔ جو بعد میں غیر قانونی قرار دیا گیا۔

عبدالحق

علامہ عبداللہ العمادی

کلیاتِ اقبال کا مقدمہ

آج جب کہ ہماری شاعری گرفت وگیر کی نزاکت میں عیارانہ مشاقی پیدا کرنے کے لیے ''اس طرح کہ گھونگر وکوئی چھاگل کا نہ بولے'' پر زور دے رہی ہے اور ''جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھالو'' کے فلسفہ کی عملی تعلیم دینے پر آمادہ ہے، سخن سنجی کو دعویٰ ہے کہ واعظ کے مونھ پہ مہر لگادوں کباب کی'' اور سخن سنج یہ مستزاد الاپ رہا ہے کہ ''داڑھی کو دیا اس کے لگا بزرقونا۔ اور بجنے لگی گت'' اس وقت یہ عرض کرنا شاید بے محل نہ ہو کہ ہماری یہی شاعری کبھی ملکی وقومی اغراض کے تابع تھی اور اسلام کی علم برداری کا کام اس نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ انتقام اہل بیت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کمیت سے ایک قصیدہ لکھاتا ہے جس کے اثر سے دمشق سے لے کر اندلس تک تلواریں چل جاتی ہیں، دولتِ بنی امیہ کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور عباسیوں کے لیے پیش قدمی کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ ابراہیم بن المہدی ایک قصیدہ سناتا ہے اور نصرانیت سے اسلام کا انتقام لینے کے لیے تمام بغداد قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑتا ہے۔

یہ عربی شاعری کا انداز تھا جس سے افسوس ہے کہ ہمارے تعلقات آج کل دور جاپڑے ہیں لیکن فارسی بھی اس خصوص میں کچھ ایسی پیچھے نہیں، دیکھو، سخنوری کا دربار گرم ہے، عثمان مختاری ایران میں بیٹھا ہوا ہندوستان کے فتوحات نظم کرکے ایرانیوں کو جہاد کے لیے آمادہ کررہا ہے، کمال اسماعیل کفر سے بدلہ لینے کی داد دیتا ہے۔ کہ ''تو داد منبر اسلام بستدی ہے زصلیب''، عمعق نجاری زوالِ دولتِ اصفہان کا مرثیہ کہہ کے قوم میں حرکت پیدا کرنا چاہتا کہ ''خاک خوں آلودا ے باد باصفاہان'' برظہیر اگر چہ خاندان خوارزمشاہ کا موروثی مدّاح ونمکخوار ہے مگر خوارزمشاہ جب بغداد پر لشکر کشی کرکے انقلابِ خلافت کا ہنگامہ برپا کرنا چاہتا ہے اور شیخ شہاب الدین سہروردی (قدس سرہٗ) کی سفارت کو جو بغداد سے اُسے سمجھانے آئی ہے اپنے زعم میں ذلیل کرکے واپس کرتا ہے تو غیظ وغضب کے عالم میں طنز کے طور پر ظہیر کے اسلامی جذبات اس کو یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ:

شاہا عجم چو گشت مسلّم بہ تیغ تو — لشکر بہ سُوئے خوابگہِ مصطفےٰ فرست
پس کعبہ را خراب کن ونادداں بساز — خاکِ حرم چو ذرّہ بسوئے ہوا فرست

از کعبہ جامہ باز کن ودر خزانہِ نہ　　والگاہ روضہ را دوسہ گز بوریا فرست
تاکافری تمام شود پس بہ کرخ رو　　وانگہ سرِ خلیفہ بسوئے خطا فرست

غزّ وں کا وحشی گروہ سلطان سنجر کو گرفتار کر کے خراسان کو لوٹ لیتا ہے خراسانیوں میں تو دم نہیں مگر انوری اپنے اہتمام سے ایک سفارت دیتا ہے جس کے صدر امیر کمال الدین بنائے جاتے ہیں اور وہ سمرقند پہنچ کر، جہاں کے حکمران ملک ضیاء الدین ہیں، ایران کی تباہی پر تورانیوں کو غیرت دلانے کے لیے انوری کا یہ قصیدہ سناتے ہیں جس کے چند شعر آپ بھی سُن لیں ۔

خبرت نیست کہ از ہر چہ در و چیزے بود　　در ہمہ ایراں امروز نمانداست اثر
بر بزرگان زمانہ شدہ خرداں سالار　　برکریمان جہاں گشتۂ لئیماں مہتر
بر درِ دُوناں احرار خرین وحیراں　　درکفِ رنداں ابرار اسیر ومضطر
مسجدِ جامع ہر شہر ستورِ شاں را　　پایگا ہیست کہ نہ سقفش پیداست نہ در
خطبہ نکند بہر خطہ بنام غز، ازانکہ　　درخراساں نہ خطیب است کنوں نے سبز
کُشتہ فرزند گرامی واگرنا گاہاں　　بیند ازبیم خروشید نیارو ماور
ہست در روم وخطا امن مسلماناں را　　نیست یک ذرّہ سلامت بہ مسلمانی در
بر مسلماناں زاں گونہ کنند استخفاف　　کہ مسلماں نکند صد یک ازاں برکافر
رحم کن رحم براں قوم کہ نبود شب وروز　　در مصیبت شاں جز نوحہ گری کار دگر
رحم کن رحم براں قوم کہ جویند جویں　　از پسِ آنکہ نخورندے از ناز شکر
رحم کن رحم براں قوم کہ رسوا گشتند　　از پس آنکہ بزیبائی بودند سَمَر
رحم کن رحم برآنہا کہ نیابند نَمدُ　　از پسِ آنکہ ز اطلس بودے بستر
وقت آن است کہ یا بندز رحمت زنہار　　گاہ آن ست کہ گیرند زتیغت کیفر
ہمہ پوشند کفن چوں تو بپوشی خفتاں　　ہمہ کواہند اماں چوں تو براری مغفر

اردو اگرچہ بہت دیر کے بعد اس شاہ راہ ملی پر گرم رَو ہوئی ہے مگر اقبال کی قیامت کی چال نے اس تاخیر کی تلافی کر دی اور اب اردو کو بھی یہ کہنے کا موقع ملا کہ ''اگر دیدا ندم شیر آمدم شیر'' مسلمانوں پر جو وقت اب آپڑا ہے زوالِ تمدنِ عرب کی صدیوں میں بھی یہی بلا دست وگریباں تھی، شاعری نے اس زمانہ میں بھی تحریک بیداری کی سربراہ کاری اپنے ذمہ لی تھی مگر یاس اتنا غالب تھا اور قنوط نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اب اسلام کی عظمت سابقہ تو عود کر سکتی نہیں،

مسلمانوں کے پاس جو کچھ رہ گیا ہے یہی بچا رہے تو بہت ہے۔اس عہد کی شاعری اسی نظریہ پر زور دیتی ہے اور کہتی ہے۔

طمع مدار کہ کُفّار بشکنند صلیب
بس است ایں کہ نہ بندند موموناں زُنّار

لیکن اقبال کا دل وحیِ اِلٰہی کا آئینہ دار ہے، کشف غطاء نے اس کے سامنے سے آسمان وزمین کے پردے اٹھادیئے ہیں اوراس کو صاف نظر آرہا ہے کہ ۵۰۰ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نظامی نے مخزن اسرار میں جو فریاد کی تھی اس چودھویں صدی میں وہ دُعا مستجاب ہونے کو ہے۔توحید کی عن قریب آنے والی عظمت کا نظّارہ اس کے روبرو ہے۔اوروہ ''محوِحیرت ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی'' ہرایک اسلامی زبان کی شاعری میں یہ خصوصیت اقبال ہی کے لیے ودیعت تھی اور دنیا بھر میں یہی ایک حسّانُ الہند ہے جو گوری شنکر (ایورسٹ) سے لے کر پرینیز تک کی چوٹیوں پر اِعلائے لوائے نبوی کے لیے قوم کو آمادہ کررہا ہے۔

ہندوستان کو دکن کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ اس کے بہترین فرزند مولوی عبدالرزاق صاحب ایچ۔سی۔ایس کے جذبات ملّی اس مدوّنۂ حکمت و دیوان رسالت کو منصۂ شہود پر لارہے ہیں۔

OOO

پروفیسر عتیق اللہ

پروفیسر عبدالحق سے ایک مکالمہ

عبدالحق کے نام سے اردو زبان وادب کا کون قاری ایسا ہوگا جو واقف نہیں ہے۔ یہ نام اکثر مغالطہ بھی پیدا کر دیتا ہے کیونکہ مولوی عبدالحق کا نام، ان کی شخصیت، ان کے ادبی اور علمی کارناموں نیز عملی کارگزاریوں کے نقوش ہمارے ذہنوں میں پہلے ہی سے اس قدر گہرے مرتسم ہیں کہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر عبدالحق کو اپنی شناخت قائم کرنے میں بڑی جدوجہد اور بہت انتظار کرنا پڑا۔ یہ بات انھوں نے خود بتائی ہے کہ جب ان کی تحریریں متواتر رسائل کی زینت بننے لگیں اور یکے بعد دیگرے کئی کتابوں کا سلسلہ سا قائم ہوگیا تب جا کر ان کے حق میں کچھ فضا سازگار ہوئی۔''

> ''ارے بھائی! کیا بتاؤں بعض حضرات نے مجھے یہ مخلصانہ مشورہ بھی دیا کہ کوئی تخلص رکھ لوں۔ جیسے عبدالحق تشنہ، عبدالحق گورکھپوری محمود الٰہی کی نسبت خاص سے عبدالحق محمودی۔'' بس بس حق صاحب بہت ہوگیا مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ قہقہے لگاؤں یا ان حضرات کا مذاق اڑاؤں جنھوں نے یہ مشورہ دیا۔'''' نہیں نہیں۔ واقعی یہ مخلصانہ مشورہ ادبی سفر کے آغاز میں میرے ایک بزرگ کی طرف سے تجویز کردہ تھا۔ وہ میرے مشفق اور خیرخواہ بھی تھے سو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوتے ہوتے یہ بھی کہا کہ میں ضرور اس مسئلے پر غور کروں گا۔'''' حق صاحب، ہم مدتوں ایک ہی شعبے سے وابستہ رہے۔ آپ غالباً 1971 میں اور میرا 1978 میں تقرر ہوا لیکن 1973 ہی سے میرا تدریس سے تعلق رہا۔ اب سبکدوشی کے بعد ملاقاتوں کا وہ سلسلہ تو قائم نہیں رہا، لیکن آپ کی

تحریروں اور تصنیفات دیکھ کر خیریت کا علم ہوجاتا ہے اور پھر موبائل کی برکت کہنے کا مطلب یہ کہ 1971 سے قبل جو اِکا دُکا تحریریں نظر سے گزریں تو میں نے انھیں اس لیے نہیں پڑھا کہ پتہ نہیں یہ کون حضرت ہیں ۔مولوی عبدالحق مرحوم کا نام ہی انھیں ملا تھا۔ارے بھائی حق یا عین حق بھی کر سکتے تھے۔واقعہ یہ ہے کہ محض نام کی وجہ سے میں نے آپ کی تحریروں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔'''اچھا ہی کیا۔اس وقت بھی میری تحریریں کسی لائق تھیں اور نہ اب ہیں۔'''ارے آپ شاید ناراض ہوگئے۔'''نہیں بھائی آپ سے کیا میں کسی سے ناراض نہیں ہوتا۔میں نے تو بس آپ کو چھیڑ نے کے لیے یہ کہا۔'''پھر تو ٹھیک ہے۔''

اتنے میں عبدالحق نے گھڑی کی طرف دیکھا اور بتایا کہ میں اکثر جمعے کے دن مجنوں کی ٹیکری پر جو مسجد ہے وہاں نماز پڑھتا ہوں۔آپ مناسب سمجھیں تو ساتھ چلیے۔وہاں بہت اچھی جینٹری آتی ہے۔بات کرتے کرتے وہ اپنی تین ٹانگوں یعنی تیسری ان کی چھڑی کے ساتھ اپنے فلیٹ کا زینہ اتر گئے۔باہر ایک تھری وہیلر تیار کھڑا تھا۔ہم لوگ دس بارہ منٹ میں ٹیکری تک پہنچ گئے۔میں بغور دیکھتا رہا حق صاحب اپنے پاؤں تو مضبوطی سے نہیں جماتے تھے۔البتہ اپنی تیسری ٹانگ یعنی چھڑی کا دامن کبھی ڈھیلا چھوڑنے کی رفت ان کو نہیں تھی۔اس جذبۂ ایمانی نے ان کے چہرے کو بھی نور آگیں بنادیا تھا، جیسے ہی ہم مسجد کے قریب پہنچے بہت سے حضرات اور طلبا نے مؤدبانہ سلام کیا اور عزت واحترام کے ساتھ راستہ دیا۔ایک کرسی ان کے لیے پہلے سے محفوظ تھی، کچھ دیر میں عبدالحق اپنی تیسری ٹانگ کے سہارے منبر کے نزدیک پہنچے اور قرآن مجید کی عظمت واہمیت اور اس کے اسلوب کی انفرادیت پر نہایت نفیس، جامع اور مختصر خطبہ دیا۔دورانِ خطابت کئی آیات کے حوالے بھی دیے۔میں دل ہی دل میں ان کی یادداشت پر عش عش کرتا رہا۔انھوں نے اپنے خطبہ، جمال سے شروع کیا تھا پھر نوجوانانہ ولولہ انگیزی کے ساتھ جلال کا رنگ طاری ہوتا گیا۔مسجد میں نمازیوں کا جوش ایمانی ان کے چہروں سے مترشح تھا۔عبدالحق کی خطابت میں 35 برسوں کے درس وتدریس کا تجربہ بھی کام کررہا تھا۔وہ طلبا وطالبات میں یوں ہی مقبول نہیں تھے۔

عبدالحق جس طرح پابندِ صوم وصلوٰۃ ہیں اسی کے پہلو بہ پہلو شعبے کے ٹائم ٹیبل سے کبھی غفلت نہیں کی۔وقت سے پہلے تشریف لاتے، کلاس لیتے، کبھی ہم پیشہ رفقا کی گفتگو میں حصہ لیتے اور کبھی خاموشی سے یہ جا وہ جا۔ہر شخص میں کچھ محاسن ہیں تو کچھ عیب بھی ہیں۔لیکن ان دونوں الفاظ کے معانی متعین نہیں ہیں۔مثلاً وہ بامروت ہیں اور اپنی

مروت کا کبھی کبھی فیاضی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تو میں ان کو تکتا رہ جاتا ہوں کہ یہ وہی عبدالحق ہیں جو اصول پسند اور اپنی رایوں میں سخت ہیں، گویا تحریر میں وہ کچھ اور ہیں اور ادیبوں کے درمیان وہ کسی سے حجت پسند نہیں کرتے بلکہ ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ اردو گھر میں جدید و مابعد جدید تنقید کے موضوع پر سمینار تھا اس میں وارانسی کے ایک پروفیسر بھی مدعو تھے۔ ان حضرت نے موضوع کے برخلاف سودا کے کام میں الحاقات پر مقالہ سنانا شروع کر دیا۔ سامعین میں یونیورسٹی کے طلبا و طالبات بھی تھے۔ وہ آوازیں لگانے لگے۔ تاہم موصوف اپنا مقالہ سنا کر ہی رہے۔ وہ جیسے ہی ڈائس سے اترے جناب حق صاحب ڈائس پر پہنچ گئے اور جلال میں آکر صاحبِ مقالہ کی تحقیقی بصیرت کی تعریف میں وہ فلائی اوور بنائے کہ سامعین سکتے میں آ گئے۔

''حق صاحب، آپ کو یاد ہوگا۔ اردو گھر کے ایک مذاکرے میں آپ نے فلاں صاحب کی جو تعریف کی مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ لیکن آپ کو برصغیر ہندو پاک کا سب سے بڑا محقق قرار دینا بہت عجیب سا لگا۔

''ارے عتیق صاحب! آپ کو یہ واقعہ اب تک یاد ہے؟''

''نہیں مجھے یہ عجیب نہیں لگتا اگر آپ صرف ایک نامور محقق ہی کہہ دیتے۔ برصغیر کے ساتھ موصوف کا نام قطعی مناسب نہیں تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سقراط کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ کسی کی بے جا تعریف اس کے حق میں ایک سزا ہو سکتی ہے۔''

''آپ نے درست کہا۔ دراصل موصوف سے میری اچھی رسم وراہ ہے۔ پھر وہ غریب شہر بھی تھے۔ انھیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ دہلی کے سامعین کے سامنے یہ گستاخی کر رہے ہیں۔ خیر جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ شرمندگی سے پانی پانی ہو رہے ہیں تو محض ان کی ڈھارس باندھنے کے لیے ان کی تعریف کی تھی۔ مروت میں اس قسم کی غلطیاں مجھ سے سرزد ہوتی رہتی ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ وہ موصوف تو شرمندگی سے پانی پانی نہیں ہوئے تھے لیکن آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ دیکھیے شرمندگی کا پانی آپ کے گالوں کو بھی تر بہ تر کر رہا ہے۔''

''ارے جناب گرمی کی شدت قہر برسا رہی ہے۔آپ بھی خوب ہیں۔اسی کو برجستگی کہتے ہیں۔''

عبدالحق صاحب کے مروت پسندی کے عارضے پر فارسی کا ایک شعر یاد آ گیا۔جس پر وہ خود بھی جابے جا عمل کرتے رہتے ہیں۔

مروت نیست گر افتاد گان را
برہ بینی و مرکب راہ برانی

(مروت کے ایک معنی مردانگی اور احسان کے بھی ہیں) مردانگی نہیں اگر تم راستے میں گرے پڑے لوگوں کو دیکھو اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے وہاں سے گزر جاؤ)

حق صاحب نے مولوی عبدالحق مرحوم سے بہت سی باتیں سیکھی ہوں گی لیکن ایک بات ان کے معمولات میں شامل ہے۔ظالم عمر 75 کو عبور کر گئی اور ان کے دونوں گھٹنوں کی کٹوریاں گھس گھس کر آہ و بکا کرنے لگی ہیں۔ پنڈیاں بھی کمان کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں اور موصوف ہیں کہ صبح مقوی ناشہ کر کے تیسری ٹانگ کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے کر شام تک کے لیے گھر کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

''بھابی! ڈاکٹر صاحب کہاں گئے (تو جواب آتا ہے) وہ جانتے ہیں یا اللہ جانتا ہے بہت کم بتا کر جاتے ہیں''

''تو بھابی آپ کو ان سے شکایت نہیں ہوتی۔''

''شکایت؟ یہ کہیے شکایتیں اور وہ بھی اتنی کہ اگر زبان پر لاؤں تو الف لیلہ کی داستان بن جائے۔''

''بھابی آپ نے حق صاحب کی صحبتوں سے بہت فیض اٹھایا۔''الف لیلہ کی داستان کا سن کر بہت لطف آیا۔''

''ویسے ان کی بہت سی باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔اس سے ہمدردی اس سے ہمدردی،اس کی مدد کرنا ہے،اسے پیسے بھیجنا ہے۔وہ بہت بیمار ہے،فلاں بیوہ ہے،فلاں کو فالج مار گیا ہے۔ہمیں تو ان کی یہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔''

''جب اتنے امداد علی خاں بنے ہوئے ہیں تو گھر بار کیسے چلتا ہے؟''

''اللہ چلاتا ہے۔ الحمداللہ اس کا فضل ہے۔ رب العزت نے ان میں ہمت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کبھی گھر کے معاملات سے غفلت نہیں برتتے۔''

''بہت خوب اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ۔ پیٹ پر تو وہ جان فدا کرنے والوں میں سے نہیں ہیں لیکن ذائقہ دار کھانوں کے شوقین ضرور ہیں۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ ان کے اس شوق نے تو ہمارے باورچی خانے کو باغ و بہار بنا رکھا ہے۔ گھر کیا پوری کالونی مہکتی رہتی ہے۔''

حق صاحب کی اہلیہ جب اپنے شوہر نامدار کی شکایتوں کا دفتر کھولتی ہیں تو ہنسنا نہیں بھولتیں۔ خوش مزاج ہیں اور گھریلو فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی پسند نہیں کرتیں۔ حق صاحب کی محبت آمیز شکایتوں کے ساتھ جب ان کی تحسین و تعریف کے ناخواندہ اوراق پلٹتی ہیں تو جنابِ حق کا قد دس فٹ بلند ہوتے ہوئے میں نے بھی دیکھا ہے۔ کفایت کے حق میں ہیں لیکن بخل پر لعنت بھیجتے ہیں۔ کیا چھوٹے کیا بڑے سب کا پاس سب کا لحاظ (سب کا ساتھ سب کا وِکاس نہیں) گھر کو سجانے بنانے میں دس قدم آگے۔ خوش گفتار ہیں، خوش پوشاک ہیں اور خوش خوراک بھی بھابی صاحبہ اردو ادب میں ایم۔اے ہیں اور اردو ماحول ہی کی پرورش یافتہ ہیں اس لیے حق صاحب کی فصاحت و بلاغت کا عکس کہیں نہ کہیں صاحب نظر آتا ہے۔

عبدالحق دشمن بنانے کے قائل نہیں۔ دوست دار ہیں لیکن انھیں بھی کم ہی وقت دیتے ہیں۔ کسی سے ناراض نہیں ہوتے لیکن منھ لگانا چھوڑ دیتے ہیں۔ (منھ لگانا میں نے محاورۃً استعمال کیا ہے) ان کی پسند اور ناپسند کے پیمانے مختلف ہیں۔ کہتے ہیں عتیق صاحب اگر آپ کسی کو ناپسند کرتے ہیں تو ناپسندیدگی کی کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ میری بھی کوئی وجہ ہوتی ہے اور میں یہ وجہ کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ اسی اثنا میں اتفاق سے ایک صاحب جنھیں آپ طارق کہہ سکتے ہیں، وارد ہوگئے، سلام کیا، مصالحہ کیا، خیریت پوچھی۔ حق صاحب نے خوب ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ ان کی اودھی زبان کی تعریف کی۔ انھیں نہال کیا اور پھر وہ رخصت ہوگئے۔ میں نے حق صاحب سے پوچھا:

''آپ کو یہ حضرت تو قطعی ناپسند ہیں پھر یہ تبرکات میں سمجھ نہیں پایا۔''

''عتیق صاحب میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں کسی کو دشمن نہیں بناتا۔ آپ جسے ناپسند کرتے ہیں وہ اتفاقاً مل جائے تو اس سے خوشی کا اظہار کیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ یقیناً آپ ہمارے ایسے بھی کئی ملاقاتی ہوں گے جن کو

آپ ہم ناپسند کرتے ہوں گے۔ تکلف بھی کوئی چیز ہے۔ ایسا جھوٹ جو دوسرے کے لیے نقصان دہ نہ ہو اسے ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ عتیق صاحب! ہم تو لکھتے لکھاتے ہیں۔ ہمارے بارے میں اچھی بری رائے رکھنے والے کم نہیں ہوں گے۔''

''ارے حق صاحب! اچھی بری رائے بھی کوئی قیمت رکھتی ہے۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ رسائل میں اگر آپ کسی کی تعریف میں مراسلہ نہیں لکھتے تو کوئی آپ کی تحریر کے تعلق سے دو لفظ بھی نہیں کہے گا۔''

''مراسلہ نگاروں کی ایک الگ فہرست ہے۔ وہ ادیب نہیں ہوتے یا ادیب ہوتے بھی ہیں تو وہ انھیں کو ذکر و اذکار کے لائق سمجھتے ہیں جن سے ان کی رسم و راہ ہے۔ ورنہ بائیکاٹ۔''

''چھوڑیے حق صاحب! ہم بھی کن فضول باتوں میں الجھ گئے۔''

عبدالحق صاحب ماہر اقبالیات ہیں اور بلند نظری اور بلند ہمتی کے قائل ہیں۔ وہ صاحب علم و عمل ہیں۔ صاحبِ عزم و ارادہ ہیں۔ مقصد کا تعین کیے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھاتے۔ پہلے وہ تو صرف دو ٹانگیں رکھتے تھے اب قسمت زیادہ فیض رساں ہوئی ہے تو تیسری ٹانگ بھی مرحمت کر دی۔ رفتار میں کجی ضرور آ گئی ہے۔ لیکن تیزی میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ ارادوں میں زیادہ پختگی آ گئی ہے۔

''حق صاحب! آپ ہندوستان میں واحد ماہر اقبال ہیں اقبال کے نام سے ایک ادارہ کے منصب دار بھی ہیں۔ آپ نے اقبال کے مختلف پہلوؤں پر مضامین اور کتابیں بھی لکھی ہیں، لیکن آپ کے علاوہ ہندوستان میں اقبال کی شاعری پر ہمارے نقادوں کی توجہ کم کیوں ہے؟''

''ایسا نہیں ہے پروفیسر عبدالمغنی، محمد حسن صاحب، کلیم الدین احمد، شمس الرحمان فاروقی، شمیم حنفی اور آپ نے بھی اقبال کی طرف توجہ کی ہے۔ جموں و کشمیر میں بہت کام ہوا ہے۔ آل احمد سرور نے اعلیٰ درجے کے مضامین لکھے ہیں۔''

''باوجود اس کے اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری کے ہزار پہلوؤں کی

طرف جس سطح کے کام پاکستان میں ہوئے ہیں، ان کا سلسلہ برقرار ہے۔ ہمارے یہاں فضا ہی نہیں بنی۔''

''کچھ سیاسی وجوہات ہیں جنھوں نے تقسیم وطن کے ساتھ اقبال اور غالب کی بھی تقسیم کردی۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔''

''یقیناً، بہر حال میں شروع سفر ہی سے اسیرِ زلفِ اقبال ہوں اور مجھے اقبال کے کلام سے بیحد سکونِ قلب میسر آتا ہے۔ جب بھی اقبال کے مجموعے کے اوراق کھولتا ہوں تو ایک نئے جادو کا انکشاف ہوتا ہے۔ اتنی تہہ داریاں، کیا جلال کیا جمال، ان کی شاعری ان پر وارد ہوئی تھی۔ اقبال کو پڑھ کر ہمیں اپنی عظمت کا احساس ہونے لگتا ہے۔''

''واہ واہ، حق صاحب! آپ اقبال کو پڑھتے نہیں ہیں ان کے ایک ایک لفظ کو اپنے اندر اتار لیتے ہیں۔ لیکن قطع کلامی معاف آپ نے غالب کو غالباً حاشیے میں رکھا ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ غالب کے کلام اور خطوطِ غالب پر بھی چند مضامین ہیں لیکن کیا بتاؤں اقبال کی زلفِ گرہ گیر مجھے چھوڑتی ہی نہیں۔ بہر حال اقبال کے علاوہ میں تحقیقی کام بھی کرتا ہوں۔ فارسی شعرا پر لکھا ہے۔، رومی، حافظ اور سعدی کا تو میں عاشق ہوں۔ ان کے حوالے اکثر میری تحریروں میں آپ ہی آپ وارد ہوجاتے ہیں۔ میری تنقید میں تحقیق کا پہلو بھی اکثر در آتا ہے۔''

عبدالحق فارسی کے استاد نہیں ہیں لیکن فارسی کے بغیر انھیں تسلی نہیں ہوتی۔ وہ اقبال کے ذریعے کبھی رومی کی طرف نکل جاتے ہیں اور کبھی رومی پڑھتے پڑھتے اقبال کی کوچہ گردانی کرنے لگتے ہیں۔ انھیں اقبال کی فارسی شاعری زیادہ متنوع نظر آتی ہے۔ فارسی نظموں میں مختلف ہیئتوں کو انھوں نے آزمایا ہے۔ اقبال کے یہاں انھیں غالب سے زیادہ جمال کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ کمال یہ ہے کہ دونوں کے کلام میں فکر و فلسفے کا رنگ گہرا ہے۔ غالب زیادہ آزاد مزاج اور خورَو ہیں۔ عبدالحق نے اقبال کے ابتدائی کلام کی معنویت واہمیت کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔ اقبال کی اسلامیات کو وہ وسیع معنی ومفہوم میں اخذ کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اقبال بنیادی طور پر شاعر ہیں اور وہ شاعری کے

لیے ہی پیدا ہوئے تھے۔ جیسے جیسے ان کے علم و تجربے میں اضافہ ہوتا گیا ان کی فکر کا دائرہ تدریجاً وسیع سے وسیع تر ہوگیا۔ فلسفیانہ ذہن کو گم راہ ہونے میں دیر نہیں لگتی لیکن اقبال کے کلام میں انتشار کی کیفیت کہیں نظر نہ آئے گی۔ وہ ہر لفظ کی باگ مضبوطی سے اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ حق صاحب کا کہنا ہے کہ رومی، اقبال، غالب، حافظ، سعدی جیسی ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ عبدالحق کا کلاسک کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ جدید اور جدید تر کی طرف بس تاکا جھانکی کر لیتے ہیں اس لیے میں نے ان کی زبان سے کسی جدید شاعر کا نام نہیں سنا۔ البتہ فیض کی غزلوں کے شیدائی ہیں۔ کہیں کہیں وہ فیض کے اندر اقبال کو بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ ویسے 35-30 برسوں میں انھوں نے کبھی کسی شعبے کے شاعر کے بارے میں ذکر تک نہیں کیا۔ ظہیر صاحب کا ہنس کر نام لے لیتے ہیں۔ مغیث الدین فریدی مرحوم کی تاریخ گوئی کے وہ قائل ہیں۔ محمد حسن کو بلند پایہ نقاد کے درجے پر فائز کر رکھا ہے۔ قمر رئیس کو فکشن شناس کہتے ہیں۔ لیکن ایک 'جھوٹوں کے بادشاہ' کا نام لینا بھی گوارہ نہیں۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاً!

○○○

ڈاکٹر نسیم عباس لاہور

قرۃ العین حیدر کی نظر میں علامہ اقبال

قرۃ العین حیدر اردو ادب میں علامہ اقبال کی اہمیت سے آگاہ ہیں اور بیسویں صدی کا بہترین شاعر تصور کرتی ہیں۔ان کی نظر میں اس رتبہ تک اردو ادب میں کسی اور کو مقام حاصل نہ ہوسکا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی میں اور ادیبوں نے کام کیا مگر انھیں وہ مقام حاصل نہ ہوسکا۔جس کا انھیں بڑا دکھ ہے۔اس مقام کے حصول کے لیے نقاد ہی بہتر کام کرسکتا ہے جسے قرۃ العین حیدر نے بہتر انداز میں نبھایا ہے۔وہ علامہ اقبال کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتی ہیں۔''بیس صدی کے اردو ادب میں فقط ایک Olympian Immortal نمودار ہوا۔جس کا نام اقبال تھا اردو فکشن نے اب تک اس مرتبے کی کوئی ہستی پیدا نہیں کی۔لہذا آج ''خدایان ادب'' کا ذکر ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن انسانی سطح پر بات کیجیے تو ۱۹۰۰ء سے لے کر آج تک چند مشہور ترین شخصیتوں کے علاوہ بہت سے اچھے ادیب سامنے آئے۔ان کو طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا۔ضروری نہیں کہ ایک شخص پچاس برس ایک سے ایک بڑھیا کہانیاں لکھے تب ہی اسے یاد کیا جائے۔

قرۃ العین حیدر کو اس بات کا زبردست گلہ ہے کہ مشرقی ادب اعلیٰ پائے کا ہونے کے باوجود بھی اسے مشرق و مغرب میں وہ اعلیٰ مقام حاصل نہ ہوسکا جس کا وہ مستحق تھا۔اس سلسلہ میں وہ علامہ اقبال کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ بھی ہونے والی ناانصافی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ رومی، غالب اور اقبال جیسے عظیم شعرا کو وہ مقبولیت نہ مل سکی۔جس کے وہ مستحق تھے۔

اچھا مشرقی ادب اپنے آپ میں محصور رہتا ہے اور دوسرے درجے کی مغربی چیزیں عالم گیر شہرت حاصل کرتی ہیں۔عزیز احمد اور ہم آپ تو خیر بونے لوگ ہیں۔رومی، غالب اور اقبال کو اسی ترسیلی خلیج کی وجہ سے وہ عالم گیر شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہوئی، جو عمر خیام اور جاپانی ہائیکو نظم کو ملی۔

قرۃ العین حیدر اردو ادب میں نہ صرف اپنے آپ کو ایک اعلیٰ ادیب گردانتی ہے بلکہ وہ علامہ اقبال کی عظمت

کا واضح اور ٹھوس ثبوت پیش کرتی ہے کہ یو۔این کے ایک سروے کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کے عظیم اور قومی شاعر کی کتب کو اہمیت حاصل ہے۔جس کے لیے وہ ان الفاظ میں باور کروانا چاہتی ہیں:

ایک عزیز جو عالم طیر رکھتا ہے۔دو سال قبل کراچی سے ٹوکیو جاتے ہوئے سانتا کروز ائیر پورٹ بھی پڑٹکا۔ اس جہت سے کہ ویزا نہ رکھتا تھا۔ائیر پورٹ سے میرے دفتر فون کیا اور باتوں میں بتلایا کہ یو۔این کے سروے کے مطابق پاکستان میں شاعری کی کتابوں میں اقبال اور فیض اور نثر میں آگ کا دریا مقبول ترین کتابیں ہیں۔

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فیض احمد فیض کے حوالے سے بتاتی ہیں کہ وہ بھی اقبال کی عظمت کے قائل تھے اور اقبال کو لیجنڈ تصور کرتے تھے۔جس کے متعلق وہ ان الفاظ میں اظہار کرتی ہیں:

ایک پائیپر ہماری گلی میں آیا تھا۔اس کی موسیقی سن کر سب لوگ، مرد، عورتیں، بچے اپنے اپنے کام چھوڑ گلی میں ناچنے لگے اور ایک سنہرے زمانے کی طرف رقص کرتے چلے گئے۔ایک آئرش شاعر نے بچوں کی ایک نظم میں لکھا تھا۔ہم سب مختلف پائیپر کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔جن میں سب سے بڑا پائیپر خود بڑا ضمیر ہے۔آیا ہمارے دیس میں ایک خوش نوا فقیر فیض صاحب نے اقبال کے لیے لکھا تھا۔اقبال کو ایک لیجنڈ بنے زمانہ ہو گیا۔اب خود فیض صاحب ایک لیجنڈ بنتے جا رہے ہیں۔بلی بھائی کے ہاں دریچے میں کھڑے ہو کر صبح صبح ڈان اخبار کی سرخی دیکھی۔فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر کے لیے سزائے موت۔

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اہل مغرب کو آگاہ کرتی ہیں کہ عیسائی لوگ تاریخ اسلام سے اس قدر نجانے کیوں متعصب ہیں۔وہ اسلامی ہیروز کے افکار و نظریات پڑھنے کی بجائے ٹیگور بنگالی شاعر کو اہمیت دیتے ہیں جو قرۃ العین حیدر کو علامہ اقبال کی نسبت قطعاً ناپسند ہیں۔

''رونلڈ برطانوی ہے۔نسلاً خالص اینگلو سیکسن''تم برصغیر کی ساری خرافات سیاسیات کا ذمہ دار مجھے ٹھہراتی ہو، یہ تمھاری بھول ہے۔وہ انگلی اٹھا کر پیغمبرانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ڈاکٹر الٹ ملر کرسٹفر لی سے ٹیگور کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔''حضرت علیؓ اور امام غزالی اور ابن خلدون اور اقبال کا بھی مطالعہ کیجئے۔مگر آپ عیسائیوں کا قدیم تعصب کب مٹے گا''۔میں کہتی ہوں۔

قرۃ العین حیدر کو ایک دفعہ روس جانے کا اتفاق ہوا۔جہاں مشرق و مغرب کے تمام ممالک سے ادبا و شعرا نے شرکت کی اور انھیں بھی ادبی تقریب میں مدعو کیا گیا تھا۔بنگلہ دیش کے قائد نے ٹیگور کے افکار و نظریات پر روشنی ڈالی جبکہ قرۃ العین حیدر نے پچاس ہزار افراد کے روبرو علامہ اقبال کے متعلق بزبان انگریزی فی البدیہ تقریر کر کے روشناس کروایا۔قرۃ العین حیدر نے اس موقع پر نہ صرف روس میں بلکہ عالم تمام میں علامہ اقبال کے افکار و نظریات کو اجاگر

کیا۔قرۃ العین حیدر اس کے متعلق نہایت خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''بہت وسیع ڈائیس پر مندوبین کی تقاریر شروع ہوئیں۔ پچاس ہزار کا مجمع گھاس پر نہایت عقیدت سے بیٹھا سن رہا تھا۔ میں نے اپنی فی البدیہ تقریر بزبان انگریزی میں علامہ اقبال کو بہت Quote کیا جو ایسے موقع پر بہت کام آتے ہیں۔ایرانے روسی میں ترجمہ کیا۔ بنگلہ دیشی قائد نے ٹیگور سے شروع کر کے ٹیگور پر ختم کیا۔''

قرۃ العین حیدر اردو ادب میں الم پرستی، رومانی کرب اور رابندر ناتھ ٹیگور کی غم پسندی کا ذکر بڑے دکھ کے ساتھ کرتے ہوئے ناپسند کرتی ہیں جب کہ علامہ اقبال کی شاعرانہ خصوصیات کو اُجاگر کرتے ہوئے تاریخ ادب اردو میں ان کا ایک مقام متعین کرتی ہیں۔انھیں علامہ اقبال کی نسبت دیگر تمام مصنفین اس دور کے قابل رحم نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے اردو ادب کو درس حیات دینے کی بجائے درس موت دیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے ایسے ادیبوں کے متعلق بڑے گہرے دکھ،غم اور افسوس کا اظہار کیا ہے جو قوم کو کچھ دینے کی بجائے صرف ان کے سامنے آنسو بہانا جانتے ہیں۔ اس الم پرستی کو صرف اور صرف علامہ اقبال نے ختم کرنا چاہا مگر رابندر ناتھ ٹیگور جسے ہندو بڑا عظیم شاعر تصور کرتے ہیں اور اس کے گن گاتے ہیں۔اس نے دوبارہ اردو شاعری میں الم پرستی کو فروغ دیا۔قرۃ العین حیدر نے اس کے متعلق ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''۱۹۰۸ء میں عصمت کا اجرا ہوا۔اس کے بانی علامہ راشد الخیری نے جو''مصور غم'' کہلائے اس رویے کو عروج پر پہنچا دیا۔خواجہ حسن نظامی کی''غدر کی ماری شہزادیاں'' راشد الخیری اور خواتین ناول نگاروں کی مظلوم ہیروئینیں رومانی ہیرو ہر طرف دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ سارا ہندوستان غم پسندی میں مبتلا تھا۔اقبال کی گھن گرج نے اردو شاعری کی اہم پرستی کو ذرا کم کیا لیکن ٹیگوریت اور رومانی کرب نے پھر آنسوؤں،آہوؤں اور ٹھنڈی سانسوں کا مینہ برسا دیا۔کولونیل سماج کا ادیب و شاعر رونا ہی جانتا ہے۔''

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ترقی کی خواہاں ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ اردو ادیب کو نئی روایت کے ساتھ ساتھ قدیم روایت سے بھی تعلق رکھنا چاہئے تا کہ وہ مستقبل پر بھی نظر رکھے۔اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر کو ایک خدشہ لاحق ہے کہ ہمارا روایت سے تعلق ختم ہوتا جا رہا ہے۔لہٰذا اس روایت پر چل کر ہم علامہ اقبال کی تعلیمات اور افکار سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے مستفید ہونے کی دعوت ان الفاظ میں دیتی ہیں:

''اسد اللہ شاہ بخاری کے خیال میں روایت سے رشتے ٹوٹ جا رہے ہیں۔زیادہ تر نوجوان اردو ادیب اگر وقت سے پہلے مر گئے تو عالم بالا میں قدماً اور اقبال سے مل کر خود کو اجنبی محسوس کریں گے.....آج کے مصنف کو نہ صرف یہ کہ نئی چیزیں کے نئے نام دریافت کرنے میں بلکہ ان چیزوں کو جو پہلے سے جانی یا محسوس کی گئی ہیں،از سر نو پہچاننا اور

ان کے نام تلاش کرنے کے لیے کمر بستہ ہونا ہے۔ اردو مصنف ایک ایسی پھیلی ہوئی کمیونٹی میں رہتا ہے۔ جس کی اب تک توضیح نہیں کی گئی۔ ایک وژن، ایک فوکس کی تلاش اور ایک مقصد اور آگے دیکھنے کی جسارت اور ہمت اس کے لیے ضروری ہے۔''

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی بہتری کے لیے کوشاں ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک طویل مضمون ''افسانہ'' تحریر کیا جس میں ترقی پسند مصنفین کو داد دی ہے۔ جنھوں نے ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اور قیام پاکستان کے بعد سے لے کر آج تک اس قدر افسانوی ادب کے متعلق لکھا ہے۔ جن میں ''لندن کی ایک رات'' اور ''انگارے'' نے ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے مگر مصنفین جدت پسند نہیں اور وہ بار بار سوال اٹھاتی ہے کہ اس ملک میں اچھا ادب کیوں نہیں تخلیق کیا جاتا؟ چند ایک اچھے افسانہ نگاروں کے نام بھی گنواتی ہیں۔ جن میں سعادت حسن منٹو ،غلام عباس، ہاجرہ مستور اور خدیجہ مستور بہترین افسانہ نگار ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں جیلانی بانو کا بھی تذکرہ کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں یہ چند ایک ادیب کب تک اردو ادب کی گاڑی چلائیں گے؟ اس سلسلہ میں وہ اظہار افسوس کرتی ہے کہ ویسے تو ہم بڑے ذہین ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو علامہ اقبال، حالی، غالب اور میر تقی میر جیسے عظیم شعرا کے وارث گردانتے ہیں مگر ادبی لحاظ سے بہتر کارکردگی ظاہر نہیں کرتے جو علامہ اقبال نے ظاہر کی۔ بقول قرۃ العین حیدر:

''دعوے تو آپ کو بہت ہیں۔ ہم انٹلیکچول ہیں (بہت ہیبت ناک لفظ ہے) ہم معاشرے کا ضمیر ہیں، ہم میر و غالب و حالی و اقبال کے وارث ہیں۔ تہذیب کے محافظ ہیں (وغیرہ وغیرہ) اپنے آپ کو ''ادیب'' کہلا کر پھولے نہیں سماتے مگر جو حالت ہے وہ یہ ہے۔''

قرۃ العین حیدر کی نظر میں علامہ اقبال نہ صرف شاعر، ادیب، فلسفی، سیاست دان اور مفکر پاکستان تھے بلکہ وہ ایک بہت بڑے فلمی کہانی نویس بھی تھے۔ انھوں نے ایک فلم افغان شہزادہ کی کہانی تحریر کی۔ وہ نہ صرف علامہ اقبال کی ذہانت کی قائل ہیں بلکہ ان کے ہر فن مولا ہونے کا ثبوت بھی پیش کرتی ہیں۔

۱۹۳۴ء میں لاہور میں ایک فلم بن رہی تھی۔ اس کی کہانی علامہ اقبال نے لکھی تھی فلم کا نام افغان شہزادہ اناؤنس ہوا تھا۔ خواجہ حسن نظامی اس کے ڈائیلاگ رائیٹر تھے۔

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ترقی کے لیے ادیبوں کی اصلاح کے لیے ''اقبال ایوننگ اکیڈمی'' قائم کرنے کی خواہاں ہیں تاکہ دور جدید کے ادیب علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے آگاہ ہو سکیں۔ اس نے اس سلسلہ میں برطانیہ میں انگریزوں سے بھی رابطہ کیا اور تگ و دو کی تاکہ لوگ علامہ اقبال کے افکار سے آگاہ ہو سکیں مگر قرۃ العین حیدر ٹیگور کا

ذکر سن کر چڑسی جاتی ہیں اور وہ اقبال کے نظریات کے فروغ کے لیے مزید کوشاں نظر آتی ہیں اور وہ اقبال ایوننگ اکیڈمی قائم کرنے کی زبردست خواہاں ہیں۔

''پرسوں میلہ کمیٹی کی میٹنگ ہے۔اقبال ایوننگ کے سلسلے میں اقبال سنگھ سے ملنا ہے.....رائف رسل اور انگریزوں کے جگر مرادآبادی سے بھی اقبال ایوننگ کے لیے بات کرنی ہے اور افسوس ہے کہ احتشام صاحب اس سے پہلے ہی لکھنؤ لوٹ جائیں گے.....میں شام کو سخت ڈیپریسڈ گھر پہنچی۔اس وقت اوجیت کا فون آیا۔''ہلو.....سنو.....وہ دھاڑ رہا تھا۔دیکھو یہ ٹیگور ٹیگور ہر وقت بنگالی کا شور مچا رہتا ہے۔اب اقبال ایوننگ ہونی ضروری ہے۔ضرور ایسا ہی ہوگا۔میں نے کہا۔اگلے روز پریس کلب سے میں نے رائف رسل کو فون کیا۔(رائف علی گڑھ سے اردو پڑھ کر آئے تھے اور یہاں یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پڑھاتے تھے۔نہایت فصیح و بلیغ اردو بولتے تھے اور اکثر ہم لوگوں کو اردو کی غلطیوں پر ٹوکتے رہتے تھے۔) بھئی یہ علامہ اقبال کا سلسلہ ہے کچھ''

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے مستفید ہونے کے متعلق پاکستانیوں کے بارے میں اظہار تعجب کرتی ہیں کہ پاکستانی اپنے قومی شاعر کے نظریات کے متعلق اس قدر آگاہ نہیں۔جس قدر ہندوستانی لوگ ہیں اور انھوں نے اقبال کے متعلق بے حد کام کیا ہے اور علامہ اقبال کی اہمیت سے اس قدر آگاہ ہیں کہ انھوں نے برطانیہ میں انڈیا ہاؤس پر اقبال ایوننگ کے پوسٹر لگائے ہوئے ہیں جسے دیکھ کر پاکستانی حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔

''آج میں نے ایک عجیب بات دیکھی.....''ایک پاکستانی نے دوسرے سے کہا۔انڈیا ہاؤس میں چاروں طرف ''اقبال ایوننگ'' کے پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔میں نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر کام میں لگ گئی۔''

قرۃ العین حیدر برطانیہ میں انگریزوں کی علامہ اقبال سے متعلق دلچسپی اور افکار و نظریات سے مستفید ہونے کا تذکرہ کر کے علامہ اقبال کی اہمیت اُجاگر کرتی ہیں کہ اقبال کے متعلق انگریزوں کی دلچسپی کوئی دور جدید کا واقعہ نہیں بلکہ اقبال کی اولین تصنیف ''اسرار خودی'' کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے کیا جس سے اقبال یورپ میں روشناس ہوئے۔انگریزوں نے علامہ اقبال کو ایک عظیم شاعر تصور کرتے ہوئے اسے سرکاری طور پر اہمیت دی اور ''اقبال ڈے'' منایا۔

''دیکھو یہ ٹیگور ٹیگور ہر وقت بنگالی کا شور مچا رہتا ہے۔اب اقبال ایوننگ ہونی ضروری ہے.....اچھا.....تو خیال یہ ہے کہ اقبال اتنا بڑا شاعر تھا کہ ایک انگریز بھی اس کے متعلق تقریر کر رہا ہے.....قصہ یہ تھا کہ سرکاری اقبال ڈے کے موقعوں پر سلطنت برطانیہ کے بڑے بڑے نائیٹ حضرات کو مدعو کر کے جن کو اقبال یا ان کے کلام سے دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ان سے تقریریں کروائی جاتی تھیں۔انگریزوں کے جگر مرادآبادی صاحب انگریزی کے اچھے

خاصے مشہور شاعروں میں سے تھے اور روحانی طور پر بڑے سخت مسلمان تھے۔ مشرق کے افلاس میں ان کو خدا کی قدرت نظر آتی تھی۔ سرکار ''یوم اقبال'' پر یہ ہر سال مسجدوں کے میناروں کی تعریف میں اپنی ایک آدھ انگریزی نظم پڑھ ڈالتے تھے۔''

قرۃ العین حیدر پریس اتاشی کی ملازمت کے دوران لندن تشریف لے گئیں۔ وہاں انھوں نے اقبال ایوننگ کی تیاری میں بڑی محنت و مشقت سے کام لیا، ان کے ہمراہ رمیش سنگوی بھی تھے۔ جنھوں نے مل کر اقبال کے کلام کا انگریزی ترجمہ کرنے میں محنت و مشقت سے کام لیا۔ قرۃ العین حیدر دور جدید کے ادیبوں کی کاوش کو سراہتے ہوئے، اپنی کوششوں کا ذکر بھی اقبالیات کے حوالے سے کرنا چاہتی ہیں کہ انھوں نے اقبالیات کے حوالے سے بہت کام کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں سے لطف اندوز ہونے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

مڈل ٹمپل کی لائبریری میں بیٹھے ہوئے میں اور رمیش سنگوی اسکرپٹ کے لیے اقبال کی نظموں کو جلدی جلدی انگریزی میں ترجمہ کرنے میں مشغول رہے۔ ہمارے ساتھ ہی آل حسن کی خوبصورت بیوی کرشنا اور پی ایس ایف کا بنگالی پریذیڈنٹ ہمایوں رشید اور ترونا دیدی کے میاں دیپ بیٹھے حسب معمول کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ یہ سب قانون کے طالب علم تھے۔ اقبال کا اسکرپٹ ایک طرف رکھ کر ہم نے کسی بات پر ہنسنا شروع کیا۔ حسب معمول پھر شور مچنے لگا۔

قرۃ العین حیدر "اقبال ایوننگ میں جن حضرات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ان کا ذکر کئے بغیر رہ نہیں سکتیں اور ان کی کاوشوں کا تذکرہ کر کے ''اقبال ایوننگ'' کی کامیابی کا ذکر ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''اقبال ایوننگ'' نہایت شاندار اور کامیاب رہی۔ ہندی سیکشن والے بی بی سی تھیٹر میں اپنی ''سبھا'' پیش کر رہے تھے، آمنہ، سریکھا، انور اور غزالہ سب کے سب اس میں جٹے تھے۔

قرۃ العین حیدر نے اقبال ایوننگ کے حوالے سے نوجوان ادبا کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انہوں نے اقبال کے فلسفہ پر لندن میں تقاریر کیں اور اقبال ایوننگ کو اپنی غربت کے باوجود کامیاب بنانے کے لیے عطیے دے کر اعانت کی۔ حالانکہ انہیں اپنے مکان کو مرمت کروانے کے لیے رقم کی شدید ضرورت تھی مگر انہوں نے علامہ اقبال کے نظریات اور تعلیمات کے فروغ کے لیے حتمی کاوش کی۔ جس سے اقبالیات کے ساتھ گہری دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔

طلعت اور کمال وغیرہ کی سرگرمیوں کو رنجور صاحب بہت سراہتے تھے۔ اقبال ایوننگ میں جا کر انھوں نے اقبال کے فلسفے پر تقریر کی۔ لندن مجلس کو ہمیشہ مختلف قسم کے عطیے اپنی بساط سے بڑھ کر دیتے رہتے۔ حالانکہ رنجور

صاحب کی مالی حالت اتنی خستہ تھی کہ اپنے مکان کی مرمت تک نہ کرواسکتے تھے۔

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے متعلق ادبا کی گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے بتانا چاہتی ہے۔ جہاں لوگ نگر نگر گھوم کر مختلف نوادر جمع کرنے کے شوقین ہیں۔ وہاں ان کے کمروں میں اقبال جیسے عظیم شاعر کی کتب الماریوں سے بھری پڑی ہیں۔ جن سے وہ استفادہ کرتے ہیں۔ اس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:

کمرے میں ایک طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اقتصادیات، علامہ اقبال، فیض، کرشن چندر، پھر سریکھا کی کتابیں تھیں۔ موسیقی، بیلے، کربوگرافی، سارے کمرے میں نفیس آرٹسٹک چیزیں لگی تھیں۔ جو سریکھا اور گلشن نے سارے ہندوستان، عوامی چین اور یورپ میں گھوم کر جمع کی تھیں۔ روس کا بیلالیکا چین کے نوادر، ہنگری کی گڑیاں، اٹلی اور فرانس کی پینٹنگز۔

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے آگاہ کرنا چاہتی ہیں کہ علامہ اقبال کے افکار ونظریات یا تصانیف سے فقط ادبای مستفید نہیں ہورہے بلکہ بڑے بڑے روسا اور نواب کلام اقبال سے زندگی کے تلخ حقائق کا حل تلاش کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر بھی یہی درس نوجوان نسل کو دینے کی زبردست خواہاں ہیں کہ زندگی کے مسائل کا حل فلسفہ اقبال میں موجود ہے۔ لہذا ہمیں اقبال کے افکار ونظریات سے استفادہ کرنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

نواب سید عاشق حسین مرحوم کے جس مکان میں حسنین ماموں اور چندا ممانی کی شادی ۱۹۳۲ء اقبالیات اور قرۃ العین حیدر میں رچی تھی۔ اس میں اب نواب سید حامد علی خان (ابن نواب سید عاشق حسین خان مرحوم) کے نہوڑی داماد سید حسین مہدی رضوی ایڈوکیٹ فروکش ہیں اور اقبال کی اسرارِ خودی کا منظوم اردو ترجمہ لکھنے میں مصروف۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے تلخ حقائق کا فلسفے اور مابعد الطبیعات سے کیا رابطہ اور کس نوع کی مطابقت ہے؟ ایک نوابزادہ کزن کارل مارکس کا مطالعہ کررہا ہے۔ کچھ لوگ فلسفہ اقبال میں زندگی کا حل تلاش کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کو پاکستان کا قومی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اعلیٰ افکار ونظریات کی بدولت پاکستان کا روحانی باپ تصور کرتی ہیں۔ وہ اس بات کا اظہار خیال کرتی ہیں کہ علامہ اقبال میں بے حد صفات تھیں۔ انھوں نے مغربی فلسفہ کا عمیق مطالعہ کیا۔ وہ جمہوریت پسند تھے اور جمہوریت کو اسلامی الٰہیات اور قوانین کے مطابق ڈھالنے کی خواہش رکھتے تھے۔

اقبال پاکستان کا روحانی باپ تھا۔ وہ Westernizer تھا۔ اس فلسفے کا مغرب میں مطالعہ کیا اور مغربی فلسفیوں کے متعلق لکھا۔ اسے صرف دو مفکر پسند آئے۔ St. Thomas Aquinas اور Max

Sholer (بیسویں صدی کا مابعد الطبیعاتی مفکر جس کا نظریہ مذہبی تھا) اقبال جمہوریت پرست بھی تھا۔ لیکن جمہوریت کو اسلامی الٰہیات اور قوانین کی مطابقت کے ساتھ رائج کرنا چاہتا تھا۔ آج کل طرز حکومت کے مسائل کے متعلق جو پاکستان میں لکھا جارہا ہے اور تحریروں اور مباحثوں میں مضمر stimulation, shock, challenge سارا کا سارا مغربی ہے۔

علامہ اقبال کو بعض ادبا پروگریسو گردانتے ہیں اور بعض ری ایکشنری۔ قرۃ العین حیدر کے نزدیک اقبال پروگریسو ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ علامہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کا ذکر کرتی ہیں۔ جسے بعض لوگ ری ایکشنری کہتے ہیں لیکن قرۃ العین حیدر یہ واضح کرنا چاہتی ہیں کہ اقبال ایک پروگریسو ذہن کے مالک ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں فیصلہ ہم پر چھوڑتی ہیں کہ ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے۔ تب آپ فیصلہ کر پائیں گے کہ آیا اقبال پروگریسو تھے یا ری ایکشنری۔ اس کے لیے وہ ان الفاظ میں سوال کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے نزدیک علامہ اقبال بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ نہ صرف قومی شاعر ہونے کے ناطے ان کی معتقد ہے بلکہ ایک اسلامی شاعر ہونے کی بنا پر ان کا پیروکار ہے۔ وہ اقبال کو ایک سچا مسلمان اور عاشق دین تصور کرتے ہوئے ان کے افکار و نظریات کی قائل ہیں اور وہ اقبال کے اسی پہلو کو سب سے زیادہ پسند کرتی ہیں۔

اب علامہ اقبال کو لیجیے اور اسلامی کلچر کے متعلق ان کے نظریات..... انتہا پسندی ہمیشہ پرکشش ہوتی ہے۔ مزید برآں اقبال کا ایک پہلو ہمیشہ آپ کو جماعت اسلامی کی طرف لے جائے گا۔ مجھے ہے حکم اذان۔

○○○

پروفیسر عبدالحق

فکرِ اقبال اور نسلِ نو

اقبال کی فکری سرگزشت کا نقطۂ عروج نسلِ نو کے فکر و عمل کا نغمۂ نشاط ہے۔ ان کی تمام تر توجہ کا محور نسلِ نو پر موقوف ہے۔ ان کے سبھی سروکار اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی ان کے روبرو ہیں اور رہ روِ فرزانہ بھی۔ اقبال کو کسی اور نسل سے نہ اتنی رغبت ہے اور نہ ہی رفاقت۔ اقبال نے ربِّ کریم سے اپنے فکر و پیغام کو جوانوں کے قلب و نظر میں اتارنے کی دعا مانگی ہے۔ یہ دعا کلام اقبال میں بہت ہی منفرد اور معنیٰ خیز ہے۔ کسی اور نسل کے لیے ایسی آرزو کا اظہار نہیں ملتا۔ یہ ایک اعلانِ عام ہے اور غور طلب بھی۔

بر جواناں سہل کن حرفِ مرا
بہرِ شاں پایاب کن ظرفِ مرا [۱]

جوانوں کے لیے میرے فلسفہ کو سمجھنا آسان کر دے اور انھیں میرے فکر و نظر کی گہرائی کا شناور بنا دے۔ اس دعا اور حرفِ آرزو کی روشنی میں اقبال اور ان کے مخاطب کے درمیان ذہنی مراسم کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اقبال نے نسلِ نو کے ساتھ بچوں اور بوڑھوں کو بھی مخاطب کیا ہے ابتدائی دور کی شاعری میں بچوں سے کچھ زیادہ التفات ہے۔ کئی نظمیں موجود ہیں۔ ان میں زیادہ تر انگریزی نظموں کے ترجمے ہیں۔ دو ایک طبع زاد بھی ہیں۔ یہی بچے جواں ہوتے ہیں اس لیے ان کی اصلاح و تربیت پر خاص توجہ ہے۔ ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بچوں کے بھی بڑے شاعر ہیں ابھی تک ان نظموں کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ نہ ہی ان کے برابر دوسری نظمیں تخلیق پا سکیں۔ اقبال کی ابتدائی فکر میں بچوں کی بڑی معنویت ہے۔ بعد کے دور میں بھی وہ بچوں سے مخاطب رہے۔ مگر جوانوں کے مقابلے میں نہیں وہ بوڑھوں اور بزرگوں سے بھی ہم کلام ہوتے ہیں۔ بزرگوں کی نصیحت آمیز باتوں سے نوجوانوں کو خاص نسبت ہے۔ اقبال بوڑھوں کے تجربات اور مشاہدات سے نسلِ نو کو بہرہ ور کرنا چاہتے ہیں۔ جو ایک

کائناتی حقیقت ہے۔اس ابتدائی دور کے فکر وشعور میں اقبال نوجوانوں سے غافل نہیں رہے۔متروک نظمیں جو۱۹۰۰ء سے پہلے کی ہیں ان میں یہ اشعار موجود ہیں جو اقبال کا درس ونصیحت ہی نہیں جانِ جاں کی آرزو بھی ہے۔

جو دوڑ کے لیے میدانِ علم میں جائیں
سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں
دکھائیں فہم وذکا و ہنر یہ اوروں کو
زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم وفنوں [۲]

اقبال کی پیامی شاعری کا آغاز بھی اس دور سے شروع ہوتا ہے۔ان کے روبرو جواں سال ہی ہیں جو قوموں کی تقدیر بدل دینے کے لیے قدرت کی طرف سے مامور کیے گئے ہیں۔یہ حکیمانہ درس ملاحظہ ہو۔

جس نے پایا اپنی محنت سے زمانے میں فروغ
ہے وہی اختر جبینِ کہکشاں کے واسطے
گلشنِ عالم میں وہ دل کش نظارہ ڈھونڈنا
آنکھ کو فرصت نہ ہو خوابِ گراں کے واسطے
یہ توپوشیدہ ہے بے آرامیٔ محنت میں کچھ
جارہا ہے تو کہاں آرامِ جاں کے واسطے [۳]

مشقت ومجاہدہ،خوابِ گراں سے بیداری بے آرامیٔ محنت،اورآرام جاں سے گریز عملِ پیہم کی یہ تاکید ہی اقبال کے فکری پیغام کا حاصل ہے۔جوانوں سے اقبال کا یہ تخاطب اور تاکید ان کے فلسفہ وفکر کا نقطۂ آغاز ہے جو عمر کے ساتھ بہتر سے بہتر اور محکم ومربوط صورت میں ڈھلتا گیا۔اقبال کسی دور میں نہ تو جوانوں سے غافل رہے اور نہ اپنے نظامِ فکر سے۔ہاں وقت کے ساتھ فلسفیانہ تصورات میں گہرائی اور ہمہ گیری شامل ہوتی گئی۔بانگِ درا کے پہلے دور کی سب سے معرکۃ الارا نظم تصویر درد ہے۔جو۱۹۰۴ء کی تخلیق ہے اس کا یہ شعر حیاتِ انسانی کے دستورالعمل کا الہامی قول ہے۔

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

راہِ عمل پر گامزن ہونا نظمِ عالم کا مقصود ہے اسی میں کامرانی اور سرفرازی کے اسرار پنہاں ہیں یہی ذوقِ تپش کا اضطراب پیدا کرتا ہے جو مزاحم قوتوں کو شکست دے کر سرخ رو ہوتا ہے۔بانگِ درا کے حصۂ دوم کی پہلی نظم 'پیام' کا

مطلع ہے۔

عشق نے کردیا تجھے ذوق تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصل سوز وسازدے

اسی حصے کی تیسری نظم طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام ہے یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اقبال پہلی بار براہ راست نوجوانوں سے مخاطب ہوئے ہیں۔ اس میں ان کے پیغام کی نوعیت مختلف ہے۔ جوانوں کو لطفِ خرام کی بشارت سناتے ہیں پہاڑ جیسا سکوت قاتلِ حیات ہے۔ بے مایہ مور کی طرح چلتے رہنے میں ہی زندگی کا انبساط ہے۔ جذبِ حرم سے ہی حجاز کی انجمن میں رونق ممکن ہے۔ اس نظم کے چند کلیدی الفاظ ہیں لطفِ خرام، جذبِ حرم، انجمن حجاز، ذوقِ طلب گردشِ آدمی، سوز وسازِ زندگی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان لفظوں کے استعمال میں ایک بڑی معنویت پوشیدہ ہے۔ انھیں الفاظ کے سہارے افکار کی موجیں طوفاں بدوش ہوکر ابھرتی ہیں۔ فکر کی ترسیل میں ان لفظوں کا بڑا اہم کردار ہے۔ اقبال نے ان لفظوں میں معانی کی دنیا آباد کی ہے۔ یہ الفاظ معالعۂ اقبال میں اصطلاح کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کے فکر کا ابلاغی نظام ان مخصوص لفظوں سے محکم اور مربوط ہوا ہے۔ یہ الفاظ تقریباً اصطلاحی صورتوں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ استعمالِ عام کے یہ الفاظ صدیوں سے زباں زد ہیں مگر اقبال نے ان میں فکر ونظر کے نئے مفہوم پیوست کیے ہیں۔ فکری ترسیل میں یہ علامت کی صورت بن گئے۔ لفظوں کو نئے معانی سے آشنا کرنا اقبال کی مفہوم سازی کا کرشمہ ہے۔ خود لفظ جواں بھی اسی میں شامل ہے۔ یہ کفولت اور بلوغت کے ماہ وسال کا محتاج نہیں ہے۔

جاوداں پیہم دواں ہردم جواں ہے زندگی
اگر جواں ہو مری قوم کے جسور و غیور

زندگی اور جسور وغیور کو جواں رکھنے کا خوب صورت اشارہ ہے۔ گویا یہ صرف انسان پر ہی موقوف نہیں ہے۔ پیام مشرق میں مچھلی کا شوخ بچہ اپنی جواں فطرت کا اعلان کرتا ہے کہ وہ ہر لحظہ جواں ورواں رہتا ہے اور گردشِ ایام سے بالاتر ہے۔

ہر لحظہ جوان است وروان است ودوان است
از گردشِ ایام نہ افزوں شد ونے کاست

پیامِ مشرق میں دوسری جگہ شاہین اپنے بچے کو جوانے اصیلے کہہ کر خطاب کرتا ہے

جوانے اصیلے کہ در روزِ جنگ

پیام مشرق کی ایک رباعی میں خطۂ زمیں کے جواں ہونے کا تذکرہ ہے۔

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد

ایک دوسری رباعی میں پھول کو بھی جواں کہا گیا ہے۔

ولے گل چوں جواں شد

گویا اقبال کائنات کی ہر شے کو جواں و دواں دیکھنا چاہتے ہیں تو کفِ خاک سے بنے انسان کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟ اسرارِ خودی میں ''درحقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیات'' کا مطلع ہے۔

گرم خوں انساں ز داغِ آرزو
آتش ایں خاک از چراغِ آرزو

حرارت و تپش نور و نار، آتش و آگ، شعلہ و شرر وغیرہ کو اقبال نے جس کثرت سے شاعری میں نظم کیا ہے وہ فکر افروز ہے اور ادب میں ناپید بھی۔ یہ ان کی تفکیری ترسیل کا ناگزیر حصہ ہے۔ ان کی مدد سے ان کے فکری اسالیب کو نشاں زد کیا جا سکتا ہے اور انقلابی رویے کی بازیافت بھی ممکن ہو سکتی ہے۔

بانگِ درا میں خطاب بہ جوانانِ اسلام' عنوان کی دوسری نظم ہے۔ اسلاف کی فتح مندیوں کا ذکر کر کے حال کی پستی سے بیداری کے لیے غیرت دلائی گئی ہے کہ بزرگوں کی بخشی ہوئی قوت و شوکت کی میراث کو گنوا دینے کے سبب ہم جہاں گیری و جہاں بانی سے محروم ہو گئے ہیں۔ اقبال کے پیغام میں یہ فکر بڑی معنویت رکھتا ہے۔

لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اس بے نظیر تخلیق کا آغاز حکیمانہ خطاب سے ہوتا ہے اور ہمیں دردمندی سے موضوع کی طرف متوجہ کرتا ہے اس نظم میں مخاطب اور غائب کی علامتیں دبیز پردوں میں پوشیدہ ہیں۔ تخاطب کا یہ لطیف پیرایۂ بیان اقبال کے یہاں عام ہے۔ نظم کا مطلع ملاحظہ ہو۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اس کے بعد تجھے کہہ کر براہ راست جوانوں سے مخاطب ہوئے ہیں۔

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سردار

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار ، تو ثابت وہ سیارا

اقبال کا اندازِ تخاطب بے حد متنوع اور دل کش ہے۔ وہ اپنے تخاطب کے لیے بھی یاد کیے جائیں گے۔ اس میں شوخی ہے اور بے باکی بھی۔ ناز ہے اور نیاز بھی کہیں خود سے تخاطب ہے اور کہیں اشیاے کائنات سے۔ خالقِ کل سے اکثر لہجے میں شوخی ہے تو بندگی اور عبدیت کا عاجزانہ اظہار بھی موجود ہے۔ جبریل وابلیس، حور وفرشتہ نے مخاطب ہیں تو مظاہر فطرت کی ادنیٰ سے ادنیٰ تخلیق بھی اس تخلیق میں شامل ہیں۔ غیر مرئی اشیا سے تخاطب کی بڑی دلآویز مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔

اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو

اے خوش آں روزے کہ آئی وبصد ناز آئی

اے دردِ عشق اب نہیں لذت نمود کی

اردو کلیات میں تقریباً سو سے زائد بار لفظ ''اے'' کا استعمال ہوا ہے۔ ان میں سب سے دل نشیں اور حکیمانہ تخاطب جوانوں سے ہے۔ یہ ہم کلامی بہت ہی معنیٰ آفریں اور متنوع جہات پر مشتمل ہے۔ نسلِ نو کے خطاب میں اقبال نے علامتوں کا بھی استعمال کیا ہے جن میں واضح اشارے موجود ہیں۔ اسرار میں نوجوانوں کو اپنی پسندیدہ علامت کو 'ہما' سے منسوب کیا ہے۔

اے ھما از یمنِ دامت اجمند
آشیانے ساز بر کوہِ بلند

خوش بخت نوجوانوں کو اپنے بال وپر کی قوت سے ھما کی طرح پہاڑ کی اونچی چوٹیوں پر آشیانے تعمیر کرنے کی ہدایت دی جارہی ہے۔ دوسرا اشارہ بھی فکر انگیز ہے۔ وہ تیز رو زمانے پر سوار نوجوانوں کی آمد کو خوش آمدید کہتے ہیں جو ممکنات کی دنیا کو فروغِ نظر بخشے گا۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

اس علامتی اشارے کی زندہ مثال ان کے صاحب زادے جاوید اقبال ہیں۔ جنھیں نسلِ نو کے نمائندہ پیکر

کے طور پر مخاطب کیا گیا ہے۔ان کے ذکر میں نوجوانوں سے ہم کلامی بہت ہی فکر انگیز اور موثرات سے معمور ہے۔کئی نظموں میں انھیں سے براہِ راست تخاطب ہے۔مگر پیشِ نظر یہی نسلِ نو ہے۔پند و پیغام ہو یا اصلاح و انقلاب کے کئی حوالے نوجوانوں سے متعلق ہیں۔جاوید نامہ میں فکر و فرمایش سے مربوط بہت اہم اور بے حد خیال افروز نظم ہے۔یہ ندرتِ فکر و نظر کی تازگی، سرگرم عمل رہنے کا پر جوش پیغام اور اقبال کے اسلوبِ تخاطب کا ایک منفرد اظہار ہے۔منفی اور منکرات کی نشان دہی میں اقبال کی دردمندی اور ان کے سوز و گداز کی کیفیات بھی اثر آفریں ہیں جو معنی کی پردہ نشینی کی پرواہ کیے بغیر معرضِ اظہار میں آ گئی ہیں۔اس کا عنوان 'خطاب بہ جاوید' ہے۔مگر قوسین میں ذیلی عنوان 'سخنے بہ نثرادِ نو' ہے یہ جاوید نامہ کا اختتامیہ اور پیامی فکر و فلسفہ کی انتہا ہے۔بعض ایسے نادر رموز و نکات پیش کیے گئے ہیں۔جنھیں اقبالیاتی مطالعہ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

جاوید نامہ بذاتِ خود فکرِ اقبال کی معراج ہے۔اس فکری پرواز کی منتہا نثرادِ نو سے خطاب ہے۔ایک سو چھتیس اشعار کا یہ بیانیہ سرچشمۂ فکر اور اقبال کی آرزوئے حیات کا حاصل ہے۔اقبال مزاج عصر سے الگ ایک دوسرے ولولۂ شوق کو آواز دیتے ہیں کہ اے پسر مظاہر عالم کے سوز و ساز کو دیکھو کہ ان میں ربِ کائنات کا اقرار بوئے جاں بن کر جن وانس کے ذکر و فکر میں جا رہی ہے۔یہ اقرار صرف زبانی نہیں ہے یہ تیغِ بے نیام ہے۔لا الہ ایک ضربِ کاری ہے۔

لا الہ ضرب است و ضرب کاری است

اسی کے ضرب سے عقل و دیں، علم و فن، امامت و سیاست اس پیکر خاکی کے طواف میں جوق در جوق مصروف رہتے ہیں۔اس کی غیر موجودگی سے نوجوانوں کی تشنہ لبی و کم نگہی نورِ فطرت سے نا آشنا ہو رہی ہے۔اس قبیلے کو محکم طور پر شیوۂ اخلاص کو اپنانے کی ضرورت ہے اور کم خورد کم خواب و کم گفتار باش پر قائم رہنا ہی نشاطِ زندگی ہے۔اس کے فوراً بعد دوسرا شعر ان کے اصل کلام اور نقطۂ نظر کا اعلانیہ ہے جس کی تبلیغ و اشاعت اقبال کی زندگی کا شیوۂ گفتار ہے۔قدرت نے غالباً ان کے فکر و نظر کی روح کو خارجی پیکر میں ڈھالنے کے لیے ہی انھیں شعری تخلیق کی بے پناہ قوت بخشی تھی ان کے فکری عقیدے میں حق شناسی کے لیے خود اپنے وجود سے شناسائی لازمی ہے۔یہ منزلِ اولیں ہے۔لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے وجود سے انکار کافری ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اپنے وجود کا منکر کافر سے بھی بدتر ہے۔

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است
منکرِ خود نزد من کافر تر است

یہ شیوۂ اخلاص ہے جو زندگی کو مستحکم بناتا ہے اور سلطان و سلاطین کے خوف سے محفوظ رکھتا ہے۔یہی جواں

مردی کے آداب ہیں جس میں فقر وغنا کو بہ شوق قبول کر کے اپنے وجود کے قندیل کو روشن رکھنے کی ضرورت ہے۔ مردِ جواں سال کی نکتہ رسی قابلِ رشک ہے۔ اقبال جوانوں سے مخاطب ہیں کہ اے فرزندانِ عزیز اپنے وجود کے عرفان کے لیے سخت کوشی اختیار کرو اور مزاحم قوتوں کو شکستِ فاش دو۔ فرزندانِ عزیز کہہ کر اقبال نے صرف اپنے بیٹے کو ہی نہیں دنیا کے تمام جوانوں کو آواز دی ہے۔ گویا جاوید اقبال ایک علامت ہیں۔ مراد سارے جہاں کی نسلِ نو ہے۔ نوعِ انسانی کے نوجوانوں سے خطاب کی دوسری اور سب سے مضبوط و منفرد دلیل بھی انتہائی فکر انگیز ہے۔ جس سے اقبال کی وسعتِ نظری اور ہمہ گیر آفاقی حسیت کا یقین ہوتا ہے۔ اس خطابیہ کی روح اور فکرِ اقبال کا نقطۂ معراج بنی نوع بشر کا احترام و اکرام ہے

حرفِ بدر ابر لب آوردن خطاست　　کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا است
آدمیت احترامِ آدمی　　باخبر شو از مقامِ آدمی

انسانیت یہ ہے کہ وہ سب سے شیر و شکر ہو کر رہے اور قدم سے قدم ملا کے چلے۔ ایسا انسان اپنے معبود سے طریقِ زندگی حاصل کرتا ہے اور ہر ایک پر شفیق ہوتا ہے۔ نوجوانوں سے یہ تخاطب تاثرات اور محبتوں سے معمور ہے یہ بنی نوع انسان کی عالمی وحدت کا آفاقی ترانہ اور انقلابی نغمہ ہے جو نوجوانوں کے جان و تن میں سرمستی و سرشاری کے آہنگ بیدار کرتا ہے۔ فکر و نظر کی سطح پر نوجوانوں کے لیے یہی ذوقِ انقلاب ہے جو درونِ دل محبت کے بے کراں طوفان کو جنم دیتا ہے۔ یہ طوفان پہاڑوں کے دل چیر کر انھیں خس و خاشاک میں تبدیل کر دیتا ہے۔

پس چہ باید کرد میں کئی مقام پر جوانوں کے کردار کو پر جوش رکھنے کے لیے حکیمانہ اظہار موجود ہے۔ نسلِ نو کے لیے فکر و نظر یا دین و ایمان پر عزم و استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہنا لازم ہے جب ہی خیر و شر کا فرق محسوس ہو سکتا ہے۔ اور ایک نگاہ میں عالم آب و خاک کو زیر و زبر کیا جانا ممکن ہے۔ کیونکہ اس کے گریبان میں ہزاروں قیامتیں موجود ہیں۔

در گریبانش ہزاراں رستخیز

اس جہانِ چار سو کو مسمار کر کے اپنی مرضی کی دنیا آباد کرنے کی ضرورت ہے۔

بر مراد خود جہاں تعمیر کن

دل کے اندر موجود ذوقِ انقلاب کو مردہ نہ ہونے دو۔ جہانِ کہنہ سے قطعِ تعلق کر دو۔ دل کو یقین و ثبات سے روشن کرو۔

دل زغیراللہ بہ پرواز اے جواں
ایں جہانِ کہنہ در باز اے جواں

نظم افتراقِ ہندیاں میں نوجوانوں کے لیے حکمت ودانائی کی باتوں کو باور کرانے پر زور ہے ہم غلامی میں پیدا ہوئے مگر آزاد ہو کر موت کو مردانہ وار لبیک کہہ کر قبول کرو۔ یہ کام تمہارے اختیار میں ہے۔

در غلامی زادۂ آزاد میر

یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اقبال کی نظر میں نسل نو ہی جواں سال ہے جواں بخت اور جواں ہمت بھی۔ یہی ارتقائی صورت میں مردمومن یا مردکامل بن جاتا ہے۔ اوراس کا تخاطب مردمومن بندۂ مومن، بندۂ آزاد وغیرہ مختلف ناموں سے ہوتا ہے۔ یہی تصور ہے جوان کی فکر اور شعری محاورۂ بیان میں ہر سو نظر آتا ہے۔ ان ناموں کے ساتھ اشارات میں بھی یہی پیکر دیکھنے کو ملتا ہے۔

اپنی مرضی سے موت کو قبول کرنے کا مشورہ حکم وہدایت کا درجہ رکھتا ہے۔ بلکہ یہ اقبال کے فکری پیغام کا اہم کردار ہے۔ خوف وخطر کے اندیشوں سے بے نیازی کا سبق بار بار نظر سے گزرتا ہے۔ اسرارِ خودی میں یہ ایک مستقل عنوان ہے۔ پس چہ باید کرد میں اقبال نے ایک جگہ نوجوانوں کے مہلک رویہ کی ملامت کی ہے کہ عصر حاضر میں بزرگ حمیت وحیا کو بھول بیٹھے ہیں اور جوانانِ عصرِ حاضر عورتوں کی طرح تن بدن کو سنوارنے اور سجانے میں مشغول ہیں۔

از حیا بیگانہ پیرانِ کہن
نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن

'پس چہ باید کرد' میں بھی اقبال نے ہند کے بوڑھوں اور جوانوں کی بدنصیبی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ ایک فراست وبصیرت سے خالی ہے۔ اور نسلِ نو محبت واخوت سے ناآشنا ہے۔ ان وجوہات سے غلامی کی زنجیر پائی سے نجات نہیں مل رہی ہے۔

پیرِ مرداں از فراست بے نصیب
نوجوانان از محبت بے نصیب

اقبال نے جوانوں کی درجہ بندی بھی ہے انھیں جوانوں کی وہ جماعت پسند نہیں جو کوتاہ دست 'کور ذوق' کم زور اور کم نگہی کا شکار ہو۔ جو مستیٔ کردار وکفن سے ناآشنا شمشیر وسناں کے حرب وضرب سے محروم ندرتِ فکر وعمل اور ہنگامۂ پیکار سے عاری اور مرغانِ سحر کی بانگ سے خوف زدہ ہوتا ہے۔

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں
جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش؟

مثنوی مسافر میں ظاہر شاہ پر جو نظم ہے اس میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے اقبال زمان ومکان کے نظریہ کو پیش کرتے ہیں جو اس پس منظر میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمیں علم ہے کہ ان کا مخصوص نظریۂ زمان ومکاں ہے وہ نسل نو کو بھی اس کا حامل بنانا چاہتے ہیں کہ موجود ہی اصل ہے۔ جو کچھ کر گزرنا ہے وہ اسی حال میں ممکن ہے۔ اس میں دوش وفردا بے معنی ہیں۔ تمہارا مستقبل تمہارے حال کا منتظر اور وہ اسی پر منحصر ہے۔

باتو گویم اے جوانِ سخت کوش
چیست فردا دخترِ امروز ودوش

ساقی نامہ میں اقبال نے جوانوں کو پیروں کا استاد بنانے کی دعا مانگی ہے۔ مگر ارمغان حجاز میں ساقیٔ ازل نے اس پرانی شراب کی فرمایش کی ہے جو پیرِ کہن سال کو نوخیز و جواں سال بنادے۔

بیا ساقی بیا راں کہنہ مے را
جوانِ فرد دیں کن پیر دے را

یہ بات اہم ہے کہ اقبال بوڑھوں کو اس بے پناہ قوت کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں جس سے خونِ گرم میں حرارت وحرکت کے شعلے لپکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کمزوروں میں طاقت وتوانائی پیدا ہو۔ کنجشک فرومایہ کو شاہین سے لڑانے کی ترغیب اس فکر کی وجہ سے ہے۔ بے مایہ کمزور پرندے میں ایسی جگر تاب طاقت پیدا ہو جائے کہ وہ شہباز وشاہین کو شکست دے سکے۔

اقبال نے ایک دوسری نظم فلسفہ زدہ سید زادے کے نام ہے۔ یہاں بھی علامت کے طور پر جاوید اقبال ہی روبرو ہیں۔ ضربِ کلیم کی یہ نظم کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ سید زادے جاوید اقبال ہی نہیں پوری نسلِ نو ہے جس کے شعلۂ جنوں کے بے سوز ہونے پر اقبال رنجیدہ ہیں۔ زندگی کی نامحکمی پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ مسلکِ زندگی کے روز وشب کو اسرارِ دیں سے محکم بنانے پر غور کرتے ہیں۔

بالِ جبریل میں پانچ اشعار کی حامل ایک نظم جاوید اقبال کے نام ہے۔ اس مختصر نظم میں خودداری وخودشناسی کی تاکید کے ساتھ نسلِ نو کو مغربی تہذیب کے فکر وفسوں سے پرہیز پر زور ہے۔ یہ ایک مستقل سبق ہے جو نوجوانوں کی ذہن سازی کے لیے ازبس ضروری ہے۔ زرق برق زندگی کی آسائشوں سے گریز اور تن آسانی سے نفرت کرنے والی زندگی اقبال کی تربیت میں بنیادی پہلو ہے۔ اس علامتی خطاب میں نسلِ نو ہی پیشِ نظر ہے۔ ان کی تاکید ہے کہ مغرب

کے بارِاحساں سے بے نیاز ہوکر اپنی سرزمین سے سامانِ زندگی حاصل کرو۔ امیری کے آداب ترک کر کے صبر وقناعت سے کردار کو محکم کرو۔

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا وجام پیدا کر

بال جبریل کے آخری شعری میں حکیمانہ اشارہ بڑی دل سوزی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اسے قوم کے لیے دُرناب سے بھی زیادہ بیش قیمتی اور جاں بخش قرار دیا گیا ہے۔ انگریزی شراب کو زہر آب یعنی جان لیوا زہر کہنا اقبال کی مغربی تہذیب سے بیزاری کی شدت کا اظہار ہے۔ قوم کے جواں سال بچوں کو آگاہ کرنے میں ان کی بے تاب شعوری فکری کاوش کو دیکھا جاسکتا ہے۔

زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خود دار وہنر مند

اقبال کی نظر میں انگریزوں کا اقتدار اور ان کا ظالمانہ رویہ بہت مذموم ہے۔ وہ ایشیا کی سرزمین پر غاصب کے طور پر قابض ہوئے۔ زمینِ ایشیا ان کی ستم رانیوں سے نالاں ہے۔ اقبال کی انقلابی آواز نے مغرب کو جگہ جگہ مخاطب کیا ہے۔ ان کا یہ خیال بڑی حقیقت کا انکشاف ہے۔

مشرق از سلطانیٔ مغرب خراب

جوانوں کی مغرب زدگی اور سامانِ آسایش سے بھرپور زندگی اقبال کو کھٹکتی ہے۔ جن سے تن آسانی اور آرام پسندی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ زہر قاتل ہیں اور بدون تریاق بھی ہیں۔ زندگی جہدِ مسلسل ہے اور آسایش قاطعِ حیات ہے۔ اقبال کو ایسے عناصر سے نفرت ہے۔ وہ نسلِ نو کو ان کی ضرر رسانی سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

نوجوانوں کو اپنی خاک وخمیر کے وقار کا احترام کرنا چاہئے۔ بجلی کی قمقموں کی جگہ مٹی کے دے سے محبت ضروری ہے۔ تہذیب حاضر کی روشنی میں گم ہونے کی ضرورت نہیں اپنے وجود کی بقا کے لیے لازم ہے کہ اپنی تہذیبی شناخت کو تمام تر مزاحمتوں کے باوجود فروغ دیا جائے۔ اس کی پاسبانی اور حفاظت کی جائے۔ بالِ جبریل میں ''ایک نوجوان کے نام'' اقبال کی انتہائی فکر انگیز اور موثرات کی حامل نظم ہے۔ اس کے اشعار زبان زد خاص وعام ہیں اور وہ محاورۂ زبان میں ڈھل گئے ہیں تخاطب کے اسالیب اور آہنگ میں تنوع کے ساتھ ترسیل بے حجاب ہے، محسوس ہوتا ہے کہ فن کار نے ترکش کے تراشیدہ تیر استعمال کیے ہیں۔ اقبال نے گہرے تصورات اور بھرپور موثرات سے معمور مختصر نظموں کو دائمی زندگی بخشی ہے اس کی مثال یہ مذکورہ تخلیق بھی ہے۔ فلسفۂ پیغام اور ترسیل کی دل کشی سے مربوط

ومرکب ایسی تخلیقات نے فن کی ابدی حقیقتوں کو منکشف کیا۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

طرزِ تخاطب میں رعنائی ہے اظہار بھی پرکشش ہے۔مخاطب کے لیے اشاراتی الفاظ ترے، تجھ، تیرا، تو بہت ہی برمحل استعمال کیے گئے ہیں ایک شعر میں یہ الفاظ نہیں ہیں مگر کلام مخاطب سے ہی ہے۔ جیسے

نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم وعرفاں ہے

نہیں تیرا نشیمن، تو شاہیں ہے، نہ زورحیدریؓ تجھ میں جیسے الفاظ انداز بیان کے ساتھ ترسیل کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔اس نظم میں نسلِ نو کے لیے محکم لائحہ عمل اور منشور بھی پیش کیا گیا ہے۔ جس میں جدوجہد امیری وآسائش سے نفرت، غیروں سے بے نیازی، بلند نگہی، خودداری وخودشناسی، عزائم کی تکمیل وغیرہ اہم فکری عناصر شامل ہیں۔اقبال نے نئی تہذیب خاص طور پر مغربی تہذیب کی اکثر تنقید کی ہے جس کے فسوں میں نسلِ نو مقاصدِ حیات سے محروم ہو رہی ہے بانگِ درا کی نظم تہذیب حاضر میں شعر ہے

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی یہ بے باکی

اقبال کہتے ہیں کہ اگر دلوں میں سوز وساز ہے تو اپنی آگ روشن کر گویا زندگی اپنے ہی لہو میں جلنے کا نام ہے۔اقبال نے بارہا تہذیب فرنگ سے نسلِ نو کو آگاہ کیا ہے۔بال جبریل کا شعر ہے:

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

ان معروضات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی توجہ اور ترجیحات میں یہی نسل پیشِ نظر ہے۔تخلیق کے دوسرے عنوانات ذیلی اور ضمنی محسوس ہوتے ہیں۔درحقیقت یہی نوجواں پسندیدہ پیکر مردِ مومن بن جاتا ہے۔ جو فلسفہ وفکر کا مرکزی محور ہے۔یہی مردِ میداں ہے اور میرِ لشکر بھی نوری وحضوری اس کی نگہبانی کرتے ہیں یہی مردِ کار قوموں کی

تقدیرِ قلم بند کرتا ہے۔ اقبال کی امیدیں اور آرزوئیں اسی نسلِ نو سے وابستہ ہیں۔ اقبال نے تاریخ عالم کی بڑی حقیقت کو اپنے نظامِ فکر کا اساسی عنصر قرار دیا ہے کیوں کہ انسانی فتح وشکست کی تاریخ اسی قبیلے کے خونِ گرم سے رقم کی جاتی ہے۔ اس حقیقت سے چشم پوشی کرنا اقبال کے لیے ممکن نہ تھا۔ غلام ملک کی آزادی کے لیے نوجوانوں کو ہی خونی کفن پوش ہوکر کارزار میں صف بستہ ہونے کی ضرورت تھی۔ عدم تشدد اور فاقہ کشی موثرات سے محروم ہوتے ہیں۔ مصافِ زندگی کا معاملہ ہو تو سیرتِ فولاد کارگر ہوتا ہے۔ وقت کی شدید ضرورت نے بھی اقبال کو نوجوانوں سے مخاطب ہونے کے لیے مائل کیا۔ اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کا فلسفہ وفکر عصری تقاضوں کا زائیدہ ہے اور تربیت یافتہ بھی۔ فلسفہ کو خونِ جگر سے لکھنے کا یہی جواز ہے۔ بے کسی و بے حسی کی بیماری نے خود شناسی اور جہاں بانی کے جذبے کو بیدار کیا۔ جو ذہنی غلامی کی قبا چاک کر کے احتجاج وانقلاب کے لیے برسرِ پیکار ہوا۔ آسمان کو مسمار کرو اور ایک دوسری دنیا کی بنیاد رکھو طلوعِ اسلام کا یہ مصرع بے سبب نہیں ہے۔

فلک را بشگافیم وطرح دیگر اندازیم

فرمانِ خدا کے اشعار اسی انقلابی آواز کے ترانے ہیں۔

کاخ امرا کے درودیوار ہلا دو
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اقبال اپنے آئینۂ افکار میں آنے والے حادثات کی دھندلی تصویر دیکھ لیتے تھے۔ یہ ان کی وجدانی نظر اور چشمِ بصیرت کا معمول تھا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندی نوجوانوں کے ضمیر میں انقلابی روح انگڑائی لے رہی ہے۔ اقبال لبیک کہتے ہیں

در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید ۵

انھیں صف بستہ تیغ بند اور صورتِ سیماب مضطرب کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کے فکر ونظر کی شعلہ نوائی نے انھیں کارزار میں لا کھڑا کیا۔ بوڑھا شاہین اپنے بچے کو مردانہ وار جینے کا سبق سکھا رہا تھا کہ اپنے لہو کی آگ کو گرم رکھو اور سخت کوش بنو تا کہ زندگی کی تلخیوں کو شہد میں تبدیل کر سکو۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی نے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

اقبال کے گوشۂ دل میں محسوسات کی ایک دنیا آباد تھی وہ ہندی نسلِ نو کے ساتھ آفاقی وسعتوں میں بھی اس قبیلے کے جذبہ وضمیر کی تڑپ کو محسوس کررہے تھے۔ یہ ان کی بصیرت اور ادراک سے بھرپور دور بینی تھی۔ اقبال کے زمانے اور کرۂ ارض پر ہونے والے حادثات کو نظر میں رکھیں تو ان کے اشعار کی گہری معنویت واضح ہوتی ہے۔

ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم　　مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور　　وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

اس دروں بینی کی بدولت تقدیرِ عالم کو بے پردہ دیکھنے کے لیے اقبال نے ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ چشمِ دل کو کھلا رکھو۔

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جو یائے اسرارِ ازل
چشم دل واہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

اقبال نے نسلِ نو کی تقدیر شناسی کے ساتھ تقدیر سازی بھی کی ہے۔ ان کے لیے منشور مرتب کیا ہے۔ اس دستور کا پہلا ضابطہ اپنے وجود کا عرفان اور اس کی نگہبانی ہے بعد ازاں ناقابلِ تسخیر فولادی قوت کا حصول ہے تیسرا مرحلہ مثالی کرداروں کے اجتماع سے خیرِ کثیر سے بھرپور معاشرہ کا قیام ہے۔ اس آئین کے مضمرات پر اکثر اظہار ہوا ہے۔ قوموں کی تعمیر وترقی نسلِ نو کے جدوجہد جاں فروشی کی منتظر ہوتی ہے۔ اس میں خود اعتمادی اور عقابی نظر کے ساتھ سوز وگدازِ زندگی کا فولادی آہنگ بھی شامل ہوتا ہے۔ فکرِ اقبال میں ناقابلِ تسخیر قوتِ فولاد حاصل کرنے پر بڑا زور ہے۔ یہی وہ اکسیر ہے جو ممکنات کی دنیا کو بھی اپنی کمند میں لاتا ہے۔ اقبال کا طرزِ تخاطب ''اے ہمتِ مردانہ'' اسی پس منظر کو پیش کرتا ہے۔ یہ ہمتِ مردانہ شمشیر وسناں کا محتاج نہیں ہوتا۔ اقبال نے بڑے اعتماد سے کہا ہے:

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں ہوتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد[۶]

یہ جواں نسل خود شناس وخود نگر ہوتی ہے۔ ظاہر اور مادی اسباب سے زیادہ خالقِ کون ومکاں کے تعاون پر بھروسہ کرکے بے تیغ بھی لڑتا ہے۔ اقبال کی نظر میں تاریخِ عالم کا وہ دور ہے جب اسلحوں سے بے نیاز مردانِ حق نے اپنے بازوں کو قوت سے بڑے بڑے قلمروں کے تخت وتاج کو پیروں کے تلے روند کر معاشرہ اور مملکت کی تشکیل کی تھی۔ ساقی نامہ کے شعر کو اسی سیاق میں دیکھیں:

تجھے کیا سناؤں تری سرنوشت
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب وزشت

قبیلے کے قیام اور معاشرے کے استحکام میں ایسے ہی جوانمردوں کے خونِ گرم کے رنگِ حنا سے داستان رقم کی جاتی ہے۔ اقبال نے اپنے لہو کی آگ میں جلنے کو شباب کہا تھا۔ شباب کی کئی شناخت اور تعریف اقبال کی نظر میں ہے۔ ایک دوسری پہچان ملاحظہ ہو۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری ے

جو شباب سکوت آشنا اور ہنگامہ ہائے شوق سے خالی ہو یا مستی کردار سے محروم ہو وہ اقبال کو پسند نہیں ہے ۔ بانگ درا کی نظم عشرتِ امروز میں شعر ہے۔

مقامِ امن ہے جنت مجھے کلام نہیں
شباب کے لیے موزوں ترا پیام نہیں

مسولینی جیسے آمر حکمراں کی انقلابی ندرت فکر و عمل کو اقبال اس لیے پسند کرتے ہیں کہ اس نے جوانوں کی ایک نسل کو تربیت دی ہے۔ نظم مسولینی (بالِ جبریل) میں جواں سال قبیلے کے ضمیر کی انقلابی آہٹوں کو اقبال نے محسوس کرایا ہے۔

چشم پیران کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب

اس خیال کی توثیق ہو رہی ہے کہ اقبال کو ایشیا عرب و عجم ہی نہیں پوری دنیا کے نوجوانوں سے سروکار ہے یہ قوم و قبیلے تک محدود نہیں ہے ۔ ہاں مسلم نوجوانوں سے بہ طور خاص بوجوہ التفات ہے۔ اس قوم کی حالتِ زار نے اقبال کی توجہ کو پہلی ترجیح میں شامل کرنے کے لیے مجبور کیا ہے۔ یہ بڑی حقیقت کے پیشِ نظر تھی۔

براعظم ایشیا و افریقہ کے بیشتر مسلم ممالک یورپ کی غلامی کے لیے مجبور تھے۔ ہندوستان کی آزادی ان مسلم ملکوں کی آزادی پر منحصر تھی۔ اقبال کی فراست نے اس سیاسی حکمتِ عملی کو محسوس کر لیا تھا۔ اقبال کے کلام میں ایشیائی بیداری ایک موضوعِ فکر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ''لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند'' کا یہی پس منظر ہے۔ اقبال کا تخاطب دنیا کی نسلِ نو سے ہی ہے کسی ایک جغرافیائی سرحد یا مسلک سے نہیں ہے۔ وہ قوم کے نوجوانوں کی جسارت و غیرت کو للکارتے ہیں:

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں ۸

کلام اقبال میں بخارا، تاتار اور ایران کے نوجوانوں کے ذکر کے ساتھ جوانانِ عرب کا ذکر بھی ہے۔

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند
ایک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب
حرم رسوا ہوا پیر حرم کی نارسائی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے ۹

ان کے مخاطب جوانانِ عرب وعجم سبھی ہیں۔ اقبال اس نسلِ نو کو خوش آمدید کہتے ہین۔ انھیں جان وتن جانتے ہیں۔

چوں چراغ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من وجان شما

اقبال کو افغانستان کی سرزمین سے جو محبت اور وابستگی ہے وہ کسی اور خطۂ ارض سے نہ ہوسکی۔ بالخصوص وہاں کے نوجوانوں سے اقبال کو ایک جذباتی تعلق خاطر ہے۔ ظاہر شاہ کو خطاب کرتے ہوئے دلی سوز وساز کے ساتھ حکیمانہ بصیرتوں کی بھی تلقین کی ہے۔ وادی وکہسار کی خوگر قوم کے نوجوانوں کی پیشانی پر لکھی ہوئی تحریر کو اقبال پڑھ چکے تھے۔ ان کے لیے صبح نوروز کے امکانات کو روشن دیکھ رہے تھے افغانی نوجوانوں کی شہنشاہی نظر میں اقبال کی نگاہِ دوربیں کسی اور زمانے کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اے سخت کوش مجاہد روز وشب کے تعینات کو درگزر کرکے افغانیوں کو وہ سوز وساز بخشو جس سے عصرِ حاضر صبح نوروز میں بدل جائے۔

باز تو گویم اے جوانِ سخت کوش — چیست فردا اخترِ امروز ودوش
باز افغاں را ازاں سوزے بدہ — عصر او را صبح نو روزے بدہ ۱۰

اقبال نے اہل چین کی بیداری کی بشارت دی ہے۔ کلام میں امریکہ وجاپان کا تذکرہ بھی فکر طلب ہے۔ براعظم یورپ کے کیف وکم کا ذکر کثرتِ تعبیر کے ساتھ موجود ہے۔ اس تفصیل کی اجمال یہ ہے کہ نسلِ نو کے وجود میں آفاق کے گم شدہ ہونے کا احوال کلام اقبال میں درج ہے۔ اسی آفاق کی تلاش وجستجو اقبال کی سب سے بڑی یافت اور سرمایۂ فکر ونظر ہے۔ انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ اپنے افکار کو جوانوں کے قلب میں اتارنا چاہتے ہیں، وہ تلاطمِ افکار کو منتقل کرسکے یا نہیں۔ مگر ایک روشن رہ گزر کو اپنی فکر ونظر سے چراغاں کرگئے۔ جس سے ہزاروں سال تک نوجواں منور اور مستفیض ہوتے رہیں گے۔

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی

اقبال کی نسلِ نو سے مخصوص نسبت کا ایک حکیمانہ نکتہ یہ بھی ہے کہ وہ قوت وشوکت کے مظہر اور محافظ ہوتے ہیں جس سے نظم عالم کا اعتبار واعتدال قائم رہتا ہے۔اس سے زیادہ اہم دوسرا زاویۂ فکر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان کے فکر و فلسفہ کا مرکزی محور خودی ہے۔ جونوجوانوں کے دلوں میں بستی اور بیدار ہوتی ہے۔یہی نسل خودی کی نمود ونگہداشت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔نوجوانوں کے پیکر خاکی سے خودی کا شعور مادی اور خارجی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔انھیں کے دلوں میں خودی اپنا نشیمن بناتی ہے۔گویا خودی و بےخودی کی خارجی یا ظاہری صورت یہی جواں سال افراد ہیں۔

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی وخود نگری کا [۱۱]

یہ دعائیہ کلمات ہیں اور اقبال کی نشو ونمائے آرزو کی آواز بھی۔اقبال کے خصوصی التفات کا یہ ایک بڑا سبب ہے۔دراصل اقبال کے بےقرار دل کی تڑپتی ہوئی آرزو کو ملاحظہ فرمائیں بہ ظاہر یہ ہسپانیہ کے حسینوں سے خطاب ہے ۔مگر حقیقت میں اقبال تمام جوانوں سے ہم کلام ہیں۔

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہیجنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں [۱۲]

حسین کا اشارہ نسلِ نو کی طرف ہی ہے۔اقبال کی فکر میں حسن و جمال قوت وشوکت سے ملزوم ہے۔جلال و جمال ایک ہی پیکر کی صفات ہیں۔اقبال نے اسی خیال پر اپنے نظریۂ جمال کی بنیاد رکھی ہے۔فکر اقبال میں آرزوؤں کی کثرت آرائی سے ان کی دلی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔یہی خواہشات ہیں جو دعاؤں کی صورت میں اکثر بیان ہوئی ہیں اقبال کی نسلِ نو سے ذہنی اور جذباتی وابستگی کا اظہار اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ربِّ جلیل سے اسی قبیلے کے لیے کثرت سے دعائیں مانگی ہیں۔انھیں کے قافلے میں اپنی متاع فکر اور حاصلِ زندگی کو لٹادینے کا بے باک اظہار بھی کیا ہے۔ان کے کردار و گفتار کی پاکیزگی کے ساتھ عزائم کو سینوں میں بیدار رہنے کی آرزو کی ہے۔ کلام میں دامنِ شباب کو بےداغ رکھنے کی دعا کا تکرار ملتا ہے۔

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ [۱۳]

ان کی شہرۂ آفاق نظم 'ساقی نامہ' کے دعائیہ اشعار ہمارے شب وروز کے محاورے میں شامل ہیں۔

خرد کو غلامی سے آزاد کر　　جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے　　دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے[۱۴]

ذرا ان کی اس دعا پر غور فرمائیں جسے اقبال نے اپنے آنسوؤں سے رقم کیا ہے۔ وہ دعا گو ہیں کہ اے ربِّ جلیل بجز اس دعا کے میرے دل میں کوئی دوسری آرزو نہیں ہے۔ کہ تو کبوتروں جیسے معصوم اور بھولے بھالے نوجوانوں کو عقابی نظر بخش دے۔

بجلال تو کہ در دل دگر آرزو ندارم
بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی[۱۵]

(اقبال اکیڈمی لاہور کے زیر اہتمام ۲۰۲۱ میں آن لائن دیے گئے توسیعی خطبے کی تحریری صورت)

حواشی

۱۔	جاوید نامہ	مناجات
۲۔	سرودِ رفتہ	فلاحِ قوم
۳۔	کلیاتِ باقیات	شعرِ اقبال
۴۔	ضربِ کلیم	محراب گل افغان کے افکار
۵۔	پس چہ باید کرد	پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق
۶۔	بالِ جبریل	اسرارِ پیدا
۷۔	ضربِ کلیم	محراب گل افغان کے افکار
۸۔	ضربِ کلیم	مسلماں کا زوال
۹۔	بانگِ درا	طلوعِ اسلام
۱۰۔	مثنوی مسافر	خطاب بہ پادشاہ ظاہر شاہ
۱۱۔	ضربِ کلیم	اے پیرِ حرم
۱۲۔	بالِ جبریل	ہسپانیہ
۱۳۔	بالِ جبریل	جاوید کے نام
۱۴۔	بالِ جبریل	رباعیات
۱۵۔	زبورِ عجم	غزل

پروفیسر توقیر احمد خان

اقبال کی نظم ''خضر راہ'' کی ضرورت

جملہ تحقیقات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کی نظم خضر راہ ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی ہے شرح بانگِ درا میں یوسف سلیم چشتی کی شرح بانگِ درا میں ایک جگہ ہے کا سنۂ تصنیف ۱۹۲۳ء لکھا گیا ہے۔ یوسف سلیم چشتی کا قول زیادہ صحیح اور مستند مانا جائے گا۔ اس لیے کہ انھوں نے اقبال کا زمانہ دیکھا اور بعض مقامات پر براہِ راست علامہ اقبال سے استفادہ کیا۔ لیکن بانگِ درا کی شرح میں یہ ۱۹۲۶ء لکھا جانا محض ایک غلطی ہے جو اصل کتاب سے کتاب کی نقل کرتے وقت سرزد ہوئی اور ہندوستان میں چھپ گئی سید مظفر حسین برنی نے کلیات مکاتیب اقبال میں اس نظم کا سال تصنیف ۱۹۲۱ء لکھ دیا یہ بھی قرین قیاس ہے اور ۱۹۲۲ء سے زیادہ دور بھی نہیں لیکن یہ بھی درست نہیں ہے۔ یہ حقیقت میں ۱۹۲۲ ہی کی تصنیف ہے جس کے ثبوت کی تفصیل آگے آئے گی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایشیاء کی تباہی کا جو منظر ۲۲۔۱۹۲۱ء میں تھا وہی آج بھی ہمارے سامنے ہے۔ جو سیاسی حالات علامہ کے سامنے اس وقت تھے وہی حالات ہمارے سامنے آج بھی موجود ہیں اگر چہ اس کے لیے خضر راہ کا ہر شعر اور ہر لفظ آج صادق آ رہا ہے تمام خیالات سے سو سال بعد بھی بعینہٖ موجود ہیں۔ ہمیں خضر راہ کا ایک شعر بہت زیادہ عزیز اور دلدوز معلوم ہوتا ہے۔

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

خضر راہ اقبال کی نظر میں:۔

نظم ''خضر راہ'' کا تذکرہ اقبال کے قلم سے اقبال کے خطوط میں بھی ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا خط میں اقبال نے ''خضر راہ'' کا ذکر کیا ہے۔ پروفیسر محمد منیر کے نام ہے۔ اس خط میں اقبال نے خط کے آخر میں لکھا ہے:

''اردو نظم ''خضر راہ'' جو میں نے حال ہی میں لکھی ہے ارسال خدمت کروں گا۔''

یہ خط کلیات مکاتیب اقبال میں منقول ہے اس سے قبل اقبال نامہ از عطا حسین میں شامل ہوا تھا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس خط کی تاریخ متعین نہیں ہے نہ اقبال نے خود اس خط پر تاریخ ڈالی۔ لیکن ڈاکٹر صابر کلوروی مرحوم نے کئی

استقرائی اور استخراجی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ اس خط کی تاریخ ۸/مئی ۱۹۲۲ء ہونی چاہئے۔ اس اعتبار سے یہ نظم غالباً مارچ اپریل یا مئی ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی ہوگی۔

اس کے بعد ایک خط سید سلیمان ندوی کے نام ملتا ہے جو ۱۴/مئی ۱۹۲۲ء کا لکھا ہوا ہے اس خط میں ''خضرراہ'' کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:

''نظم ''خضرراہ'' جو انجمن کے سالانہ جلسے میں پڑھی تھی ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہوگئی تھی۔ میں آج دریافت کراؤں گا اگر کوئی کاپی اس کی موجود ہے تو خدمت والا میں ارسال کرادوں گا۔ ساری نظم کا چھپنا تو اب ٹھیک نہیں اور نہ اس قدر گنجائش معارف میں ہوگی لیکن اگر کوئی بند آپ کو پسند آجائے تو اسے چھاپ دیجئے۔''

(ک م اجدوم ص۔۳۵۶)

ڈاکٹر صابر کلوروی نے لکھا ہے کہ:

''خضراہ'' ۱۴/اپریل ۱۹۲۲ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔''

(ک م اجدوم ص۔۵۳۔۲۵۲)

چنانچہ واضح ہوگیا ہے خضرراہ ۱۴/اپریل ۱۹۲۲ء سے کافی پہلے لکھی گئی کیونکہ اس کے چھپنے چھپانے کے اہتمام میں بھی مہینوں اگر نہیں تو ہفتوں تو ضرور لگے ہوں گے۔

۱۵/مئی ۱۹۲۲ء کو خان نیاز الدین خاں لکھتے ہیں:

''میں نے سید صفدر علی شاہ صاحب کے بدست آپ کے لیے ایک کاپی خضرراہ کی ارسال کی تھی۔ تعجب ہے کہ وہ آپ تک نہیں پہنچی۔''

(ک م اجدوم ص۔۳۵۹)

اب ۱۴/مئی ۱۹۲۲ء کا وہ خط ملاحظہ فرمایئے جو صرف نظم ''خضرراہ'' سے متعلق ہے اور اس میں علامہ نے مولانا گرامی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اقبال مولانا گرامی کو لکھتے ہیں۔

''ڈیر مولانا گرامی السلام علیکم

کل نیاز الدین خاں کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ نظم

''خضرراہ'' آپ کو پسند نہیں اور آپ کی رائے میں اس کے تمام اشعار بے لطف ہیں اور بعض غلط۔ غلط اشعار کے متعلق تو میں عرض نہیں کرتا۔ آپ مجھے اغلاط سے آگاہ فرمائیں گے تو عرض کروں گا۔ باقی آپ کے اعتراض کا پہلا حصہ صحیح ہے مگر یہ اعتراض گرامی کے شایانِ شان نہیں۔ اگر کوئی اور آدمی یہ اعتراض کرتا تو مضائقہ نہ تھا۔ یہ اعتراض منصور کے لے شبلی کا پھول ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس نظم کا بیش تر حصہ خضر کی زبان سے ادا ہوا ہے اور خضر کی شخصیت ایک خاص قسم کی شخصیت ہے وہ عمر دوام کی وجہ سے سب سے زیادہ تجربہ کار آدمی ہے اور تجربہ کار آدمی کا یہ خاصہ ہے کہ اس کی قوت متخیلہ کم ہوتی ہے اور اس کی نظر حقائق واقعی پر جمی رہتی ہے اس کے کلام میں اگر تخیل کی رنگینی ہو تو وہ فرض رہنمائی کے ادا کرنے سے قاصر رہے گا پس اس کے کلام میں پختگی اور حکمت تلاش کرنی چاہئے نہ تخیل اور خاص کر اس حالت میں جب اس سے ایسے معاملات میں رہنمائی طلب کی جائے جن کا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات سے ہو۔ قرآن شریف کی سورۂ کہف پڑھیے اور حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصے کو ملاحظہ فرمایئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے خضر کی اس خصوصیت کو کس خوبی سے ملحوظ رکھا ہے۔ ایک سطحی نظر سے دیکھنے والا آدمی تو کشتی کو توڑنے اور ایک بچے کو قتل کر ڈالنے یا ایک یتیم کی دیوار گرا دینے میں کوئی غیر معمولی بات نہ دیکھے گا اور شعریت تو اس تمام قصے میں مطلب نہیں۔ لیکن غور کرنے پر خضر کے افعال کی حکمت معلوم ہوتی ہے۔ خضر کی طرف جو کلام منسوب کیا جائے اس میں رنگینی پیدا کی جاسکتی ہے مگر وہ خضر کا کلام نہ رہے گا بلکہ نظیری یا عرفی کا کلام ہوگا۔ اور بالغ نظر اہل فن تخیل کی اس رنگینی کو بہ نظرِ استحسان نہ دیکھیں گے ان رموز اور اسرار کو آپ سے بہتر کون جانتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نیاز الدین خاں صاحب نے آپ کا اعتراض سمجھنے میں مزید غلطی کی ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔''

(ک م اجدوم ص۔۳۶۴۔۳۶۰)

بعد میں مولانا گرامی کے خط سے معلوم ہوا کہ یہ اعتراج انھوں نے نہیں کیا۔محمد عبداللہ قریشی کے بیان سے بات صاف ہوگئی کہ یہ اعتراض مولانا گرامی کا نہیں خود نیاز الدین نے کیا تھا۔

عبداللہ قریشی نے لکھا ہے کہ:

''گرامی کا نام لے کر خان نیاز الدین خاں نے نظم ''خضر راہ'' پر جو اعتراض کیا تھا اس کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے اپنے ۱۴ر مئی ۱۹۲۲ء کے خط میں گرامی کو صاف لکھا دیکھا کہ یہ اعتراض گرامی کا نہیں ہوسکتا مجھے یقین ہے نیاز الدین خاں صاحب کو آپ کا اعتراض سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔چنانچہ ایسا ہی ثابت ہوا۔'' محمد عبداللہ قریشی

(ک م اجدوم ص۔۳۶۷)

گرامی کے دو خط وصول ہونے کے بعد اقبال نے گرامی کو خط لکھا جن میں گرامی گرامی کے تردد یا صلح صفائی پیش کرنے کے سلسلہ میں لکھا:

''باقی جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کی نسبت آپ کو اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ اقبال کے نزدیک آپ کا فرمودہ وحی الہام ہے نہ کہ اور کا۔ بلکہ آپ کے خط سے تو میرے خیال کی تائید ہوئی ۔میں نے آپ کو لکھا بھی تھا کہ یہ اعتراض آپ کا نہیں ہوسکتا سننے والے کی غلطی ہوگی سو ایسا ہی ثابت ہوا۔اگر کوئی شخص دنیا میں ایسا موجود ہے جن کو گرامی کی نیت اور نیک نفی میں شبہ ہے تو وہ اقبال کے نزدیک کافر ہے۔ میں تو آپ کو ولی سمجھتا ہوں آپ کس خیال میں ہیں۔''

(ک م اجدوم ص۔۶۸۔۳۶۷)

تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یہ اعتراض خان نیاز الدین خاں کا تھا۔عبداللہ قریشی مزید لکھتے ہیں:

''خضر راہ'' کے بارے میں خان نیاز الدین خاں کی رائے سے ملتا جلتا ایک شرندہ سید سلیمان ندوی نے معارف اعظم گڑھ میں لکھا تھا جس کا جواب اقبال نے مئی ۱۹۲۲ کو دیا تھا۔''

(ک م اجدوم ص۔۳۶۰)

اقبال نے ۲۹ رمئی ۱۹۲۲ء کو سلیمان ندوی کے نام خط لکھا اور اس میں ان کے اعتراضات کے سلسلہ میں جواباً تحریر فرمایا:

''خضر راہ'' کے متعلق جو نوٹ آپ نے لکھا اس شکریہ قبول فرمایئے، جوش بیان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا صحیح ہے مگر یہ نقص ہی قلم کے لیے ضروری تھا (کم از کم میرے خیال میں) جناب خضر کی پختہ کاری ان کا تجربہ اور واقعات وحوادث عالم پر ان کی نظر ان سب باتوں کے علاوہ ان کا اندازِ طبیعت جو سورۂ کہف سے معلوم ہوتا ہے اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو۔ اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیئے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوشِ بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جناب خضر کے اندازِ طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا۔ یہ بند اب کسی اور نظم کا حصہ بن جائیں گے۔''

(ک م اج دوم ص۔۳۷۰)

بہر کیف اس بے نظیر قلم کے بارے میں محمد عبداللہ قریشی نے جو کچھ فرمایا اس کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''خضر راہ'' یقیناً ایک بے مثال نظم تھی اس میں اقبال کی شاعری نئی درجہ گاہوں تک پہنچ گئی تھی۔ آج بھی یہ نہایت قابلِ قدر نظم ہے اور اس کے اکثر اشعار کی مثال کلام اقبال کے سوا اردو یا کسی دوسری زبان کی قومی شاعری میں نہیں مل سکتی اور دعوت تو پہلے ہی یگانہ تھا آج بھی یگانہ ہے۔''

محمد عبداللہ قریشی (ک م اج دوم ص۔۳۶۱)

اس نظم کے الفاظ اور افکار کس قدر اثر دار ہیں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں، ایسا نہیں ہے کہ دنیا میں کسی کے کلام نے سوسائٹی پر اثر نہیں چھوڑا بلکہ عرض کرنا یہ ہے کہ اس ضمن میں قبل کا کلام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ پورے کلام نے کہاں کہاں دنیا کو تہہ و بالا کیا؟ کس کس کی نیندیں حرام، کہیں کہیں کس کو آنسو بہارنے پر مجبور کیا کس کس کو کام پر لگایا؟ یہ بھی ایک الگ تحقیق کا موضوع ہے۔ علامہ کی نظم خضر راہ کے تعلق سے ایک تجربہ ہمیں بھی عجیب

وغریب ہوا۔۱۹۷۸۔۷۷ کا واقعہ ہے میں بی۔اے یا ایم۔اے کا طالب علم تھا اور کورس کی کتابیں خریدنے مرادآباد ،رام پور، بریلی اور دہلی گیا تو رام پور و بریلی میں بک فروخت نے مجھے کچھ اور کتابیں دکھائیں جو کورس میں تو شامل نہیں تھیں لیکن کورس کو پڑھنے میں معاون تھیں اس میں ایک کورس کی شرح یا کنجی تھی میں نے وہ کتابیں خریدیں۔اس پبلشر کا مرتبہ دیکھا تو ''بزم خضر راہ'' لکھا تھا اور ایڈرس گلی قاسم جاں بلی ماران کا تھا کتاب کے مصنف کا نام خوشحال زیدی سرسوی تھا۔ایک بار جب دہلی گیا تو قاسم جان اسی پتہ کو تلاش کیا۔وہ پتہ تو مل گیا لیکن وہ ایک پرائمری اسکول تھا معلوم کیا تو خوشحال زیدی بھی مل گئے وہ وہاں ٹیچر تھے۔ان سے بات چیت ہوئی میں نے آپ کی اس لیے اور کورس میں شامل کتابیں پڑھیں میں ادارہ ''بزم خضر راہ'' کہاں ہے تو انھوں نے بتایا کہ جب میں نے پہلی بار علامہ اقبال کی نظم ''خضر راہ'' پڑھی تو دھن سوار ہوا کہ مجھے بھی کچھ کر دکھانا چاہئے چنانچہ میں نے زیر تعلیم اردو کے بچوں کے کورس کی سہولیات مہیا کیں اور کتابیں چھپوائیں اس ادارہ کا نام ''بزم خضر راہ'' رکھا اس دن سے آج تک متعدد کتابیں ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ۔بی۔اے اور ایم۔اے اردو کورس ادیب ماہر، ادیب کامل وغیرہ میں خوشحال زیدی کی کتابیں بہت کام آتی ہیں۔وہ کس نوعیت کی ہیں یہ بات ایسے طالب علموں کے لیے بڑے کام کی ہیں جو کورس کی قیمتی کتابیں خرید نہیں پاتے۔یا خرید بھی لیتے ہیں تو مجھے نہیں پاتے انھیں خوشحال زیدی کی کتابیں سمجھاتی ہیں۔کئی سال ہوئے خوشحال زیدی کا انتقال ہو گیا ہے۔مگر ان کی کتابیں آج بھی بچوں کے کام آرہی ہیں اور بازار میں موجود ہیں۔

○○○

ڈاکٹر شاہدہ پروینؔ فتح پوری

''علامہ اقبال کی نعتیہ شاعری''

دنیائے نعت کے وہ عظیم الشان فلسفی شاعر جنھوں نے اپنی نعتوں کے ذریعہ کائنات کو امن و آتشی، اخوت، محبت، رواداری اور انسانیت کی تعلیم دی، ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۸؍ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ م ۲۹؍دسمبر ۱۸۷۳ء کو ہوئی۔ آپ بچپن ہی سے بہت ذہین وطباع تھے۔ علامہ موصوف ذہانت اور متانت میں دوسرے بچوں سے بہت بڑھے ہوئے تھے اور طفلانہ آوارہ گردی سے طبعاً متنفر تھے، آپ کے استاد پروفیسر آرنلڈ اکثر آپ کی ذہانت وذکاوت کی تعریف کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ''ایسا شاگرد استاد کو محقق در محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔''

اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں مولوی میر حسن شاہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے لیے یورپ روانہ ہوئے جہاں سے بیرسٹری اور پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرکے ۱۹۰۸ء میں وطن مالوف واپس آگئے آپ نے ساری زندگی علم وادب کی خدمت میں صرف کردی اور ۲۱؍اپریل ۱۹۲۸ء کو عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا۔

ڈاکٹر اقبالؔ نے کثیر تعداد میں نعتیں لکھی ہیں۔ آپ کی نعتوں میں بلا کا سوز وگداز ہے، کیونکہ آپ کو حضور صلعم سے والہانہ عقیدت تھی۔ آپ کی زندگی کے بہت سے واقعات اس امر کی توثیق کرتے ہیں کہ شاعر موصوف کو پیغمبر اسلام سے اور آپ سے متعلق ہر شی سے بلا کا عشق تھا۔ اقبالؔ نے ۱۹۱۷ء میں مدینہ منورہ کا ایک کبوتر پال رکھا تھا اور اس کے دانے دنکے کی فکر خود بنفس نفیس فرمایا کرتے تھے۔ ۲۰؍نومبر کو وہ کبوتر ایک بلی کی چیرہ دستی کا شکار ہوگیا۔ اقبال اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے۔ آپ نے ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر درج ذیل ہے:

رحمت ہو تیری جان پرائے مرغ نامہ بر
آیا تھا اڑکے ذروۂ بام حرم سے تو

آپ کے عشق رسول کی بابت مولانا عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر اعتقاد ہی نہ تھا بلکہ آپ کے ساتھ انتہا درجہ کا عشق تھا۔ یہی وجہ

ہے کہ جب حضور کا نام مبارک یا ذکر مبارک کسی کی زبان پر آجاتا، تو ان کی آنکھیں بے اختیار اشک آلود ہو جاتیں، ان کی زندگی کے آخری ایام کا ذکر ہے کہ یوم اقبال کے موقع پر مولانا اسلم صاحب جسے راجپوری نیاز حاصل کرنے کے لیے گئے اور دیر تک سلسلۂ گفتگو جاری رہا۔ اس سال وہ حج کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن ہماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا بھی مشکل تھا، کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادۂ حج میں ہوں بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لیے ہیں جو سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی، جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

تو باش اینجا د خاصان بیامنیر
کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہو گیا کہ آواز بندی ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے.....''

اقبال نے مثنوی اور رباعی کی شکل میں توانا اور زوددار نعتیں لکھی ہیں، وہ اپنی نعتیہ کاوشات میں سنائی، خاقانی، رومی، عراقی، جامی اور عرفی سے کافی حد تک متاثر ہیں۔ وہ ارمغان حجاز میں مشمول ایک رباعی میں کہتے ہیں۔

گہی شعر عراقی را نجوانم
گہی جامی زند آتش بجام

اقبال نے معراج کو زمان و مکان کے معمہ کا حل سمجھا ہے، پیغمبر اسلام نے اپنی وجدانی قوت سے کائنات کے سامنے پیش کیا:

از شعور است ایں کہ گوئی نزد ودر — چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب وشوق — دارہاند جذب وشوق از تخت وفوق
ایں بدن باجان ما انبار نیست — مشت خاکے مانع پرواز نیست

شاعر نے ''ارمغان حجاز'' میں ''حضور رسالت'' کے عنوان سے (۱۱۷) نعتیہ رباعیات کہی ہیں۔ ان سبھی رباعیوں میں اقبال کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ علامہ اقبال نے ان رُباعیات میں مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ کا کامیاب سفر عالم خیال میں کیا ہے۔ وہ وفور شوق کے ساتھ ریگستانی علامہ میں رواں دواں دیکھے جاتے ہیں۔ ان کو مسکن حبیب کی ریت ریشم سے زیادہ نرم محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نعتیں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریگستان بطحا کا ہر ذرہ دل بنکر دھڑک رہا ہے اور وہ ساربان سے کہتے ہیں کہ وہ ان دھڑکنوں کا خیال کر کے چال میں نرم روی اختیار کرے:

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خداست — شبش کوتاہ در دوز او بلندیئت

قدم اے راہ رو آہستہ تر نہ چوماہر ذرۂ او درد مند است

علامہ اقبال عالمِ خیال میں نبی صلعم کے مواجھ شریف میں حاضر ہوکر درود وسلام پڑھتے ہیں اپنا حال دل سناتے ہیں اور امت مسلمہ اور عالم اسلام کے حالات اس کے مسائل ومشکلات اس کی آزمائشیں اور امتحانات نیز مغربی تہذیب وتمدن اور مادی فلسفوں اور تحریکوں کے سامنے اس کی بے بسی اور اپنے وطن میں اس کی غریب الوطنی اور خود اپنی قوم میں اپنے پیغام کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں۔ اقبال کا یہ روحانی سفر اس زمانہ میں ہوا جب کہ وہ مشہور وسنین کی بھاگ دوڑ میں ۶۰ سال سے تجاوز کر چکے تھے۔ اس سلسلہ کے چند نمونۃً درج ذیل ہیں۔

مسلماں آں فقیر کج کلا ہے امید از سینۂ او سوز آ ہے
دلش نالد چرانالد ؟ نداند نگاہِ یا رسول اللہ نگاہے
چہ گویم زاں فقیرے درد مندے مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار باوا کہ افتاد است از بام بلندے

اقبال امت مسلمہ کی زبوں حالی اور اس کی بے نظمی وبدحالی کی وجہ بھی بتلاتے ہیں۔ اقبال کی نگاہوں میں اس امت کے انتشار کی وجہ یہ ہے کہ امت جماعت تو ہے لیکن وہ ایسی جماعت ہے جس میں امام کا فقدان ہے، اس میں افراد ضرور ہیں مگر افراد کے درمیان کوئی نظام نہیں ہے۔

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است ہنوز ایں کاروان دو از مقام است
زکار بے نظام او چہ گویم تو می دانی کہ ملت بے امام است

امت مسلمہ کے ادباء کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی رگوں میں رواں دواں خون اپنی اصلی حمارت کھو چکا ہے اور اس میں مردم خیزی کی قدیم صلاحیت بھی مفقود ہو چکی ہے۔

نماند آں تاب وتب در خون مابش نردید لالہ از کشت خرابش
نام او تہی تہی چوں کیۂ او بطاق خانۂ ویراں کتاب است

وہ مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کو قدم قدم پر امت مسلمہ کے کارناموں اور پیغمبر اسلام کے ارشادات میں صرف تضادات ملتے ہیں۔ ان کو بہت سی مشرکانہ باتیں، غیر اللہ کی پرستش، ظالم وجابر حکمرانوں کی خوشامد اور ان کی قصائد خوانی کے ایسے نمونے ملتے ہیں، جن سے ایک خوددار اور غیور انسان کا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔

علامہ موصوف نے اس واقعہ کو بیان کر کے دردانگیز نتیجہ اخذ کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان اس خاتون سے

بڑھ کر عریاں اور دیگر اقوام کے سامنے بے چادر ہیں۔ حشر کے دن ہم کو آپ ہی پر اعتبار ہے۔ آپ ہی ہماری پردہ داری فرمائیں گے۔

مازاں خاتونِ طے عریاں تریم　　پیش اقوام جہاں بے چادریم
روزِ محشر اعتبار ماست تو　　در جہاں ہم پردہ دار ماست تو

شاعر نے ایک بیت میں حدیث نبوی نظم کرتے ہوئے کہا:

گفت با امت ز دنیائے شما
دوست دارم طاعت و طیب نساء

شاعر ''لولاک لما خلقت الافلاک'' اور ماعرفناک حق معرفتک'' احادیث نبویہ کو نظم کرتے ہوئے کہتا ہے:

مسلماں را ہمی عرفاں و ادراک　　کہ در خود فاش بیند رمز لولاک
خدا اندر قیاس ما نگنجد　　شناس آں را کہ گوید ماعرفناک

شاعر نے چوتھے عنوان کے تحت عشق پر بہترین ابیات حوالۂ قرطاس کیے ہیں:

عشق آئین حیات عالم است　　امتزاج سالمات عالم است
عشق از سوز دل ما زندہ است　　از شرار لاالہ تابندہ است
گر چہ مثل غنچہ دیگریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

پانچویں عنوان کے تحت مندرج ابیات میں گل سرسید کی حیثیت رکھنے والا بیت درج ذیل ہے:

نوع انساں را پیام آخریں
حامل اور رحمۃ اللعالمیں

شاعر نے چھٹے عنوان کے تحت لکھے گئے ابیات میں اس امر کو واضح کیا ہے کہ ملت کی سیرت اسی وقت استوار ہوگی جبکہ وہ اپنے آپ کو پیغمبر اسلام کے آداب سے مؤدب کرے۔ اس مثنوی کا حاصل بیت مندرجہ ذیل ہے:

طینت پاک مسلماں گوہر است
آب وتابش ازیم پیغمبر است

علامہ اقبال نے اپنی مشہور مثنوی اسرار خودی میں ''در بیان اینکہ خودی از عشق ومحبت استحکام می پزیرد'' کے ذیلی عنوان کے تحت نہایت موجز انداز میں سیرت نبوی کا عطر کھینچتے ہوئے کہا ہے:

بوریا ممنون خواب را حتش　　تاج کسریٰ زیر پائے امتش
در شبستاں حرا خلوت گزید　　قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم　　تابہ تخت خسروی خوابیدہ قوم
وقت ہیجا تیغ او آہن گداز　　دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعائے نصرت آمین تیغ او　　قاطع نسل سلاطین تیغ او
در جہاں آئین نو آغاز کرد　　سند اقوام پیش در نورود
از کلید دین او دنیا کشاد　　ہمچو او بطن ام گیتی نژاد

علامہ اقبال نے خلاصہ مثنوی میں ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ اللعالمین'' کے ذیلی عنوان کے تحت (۶۵) ابیات کہے ہیں جن کے مابین شاعر نے اچھے نعتیہ مضامین نظر کیے ہیں۔ حسن تعلیل کے استعمال نے نعتیہ مضمون کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ چند اشعار نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں:

ای زمیں از بارگاہت ارجمند　　آسماں از بوسۂ پامت بلند
شش جہت روشن زتاب روی تو　　ترک وتاجیک و عرب ہندوی تو

اقبال کی نعتوں میں جو سوز و گداز ہے، وہ جا خی کے علاوہ کسی دوسرے نعت گو شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گا۔ اقبال کس قدر درد انگیز لہجہ میں کہتے ہیں کہ میرا متاعِ حیات آپ کی محبت، آپ کا علم و عرفان اور آپ کا عشق ہے آپ ہی میرے ملجا و ماویٰ ہیں۔ مجھ آہوے زار زبوں و ناتواں کا آپؐ کے علاوہ کوئی صیاد نہیں۔ میں بڑی امیدوں کے ساتھ آپ کی ایک نگاہ التفات کا طلبگار بن کر آپ کے قدموں میں آیا ہوں:

شہسوار یک نفس در کش عناں　　حرفِ من آساں نیاید بر زباں
آرزو آید کہ ناید تا بہ لب؟　　می نہ گردد شوقِ محکوم ادب
آں بگوید لب کشا اے درد مند　　ایں بگوید چشم بکشا لب بہ بند
گرد تو گردد حریم کائنات　　از تو خواہم یک نگاہ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی　　کشتی و دریا و طوفانم توئی

اقبال اپنی دیگر شعری کاوشات کی طرح نعت میں بھی رجائیت پسند ہیں۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ میں ناکارہ ہوں لیکن مایوس نہیں ہوں، مومن ہوں، کافر نہیں ہوں، عاصی اور گنہگار ہوں لیکن بداصل دیدگوہر نہیں ہوں۔ میرے اکتسابات میں کوئی امر قابل وقعت نہیں، میری مملوکات میں ایک دل ضرور ہے، جس کا مقابلہ وقعت و عظمت

میں کائنات کی کوئی شی نہیں کرسکتی کیونکہ اس دل میں آپ کے راہوار کے نقوش پا اب بھی موجود ہیں۔ دل اسلیے وقیع ہے کہ اس کو آپ کے قدموں سے پامالی کا شرف حاصل ہے:

مومنم از خویشتن کافر نیم — بر فسانم زن کہ بدگو ہر نیم
گرچہ کشت عمر من بے حاصل است — چیزے دارام کہ نام او دل است
دارمش پوشیدہ از چشم جہاں — کزسم شد بز تو دارد نشاں

علامہ اقبال کی نعتوں کا دعائیہ حصہ سوز و گداز، اثر آفرینی اور ولولہ انگیزی میں لاجواب ہے موصوف کی ایک نعت کے دعا سے متعلق اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

اے کہ دادی کرد را سوز عرب — بندہ خودا حضور خود طلب
بندہ چوں لالہ داغ در جگر — در ستانش از غم او بے خبر
بندہ اندر جہاں نالاں جونے — تفتہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے
در بیاباں مثل چوب نیم سوز — کارواں بگذشت دمن سوزم ہنور

مرقومہ بالا معروضات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اقبال نے اپنی نعتیہ کاوشات سے نعت کے دامن کو کافی وسعت دی۔ موصوف نے اپنی نعتوں کے ذریعہ سوز دروں کی مکمل ترجمانی کا حق بھی ادا کیا۔ ان کی زبان صاف، سلیس اور رواں ہے۔ الفاظ اور ترکیب واضح شستہ اور آسان ہیں، بحریں مترنم ہیں اور حروف والفاظ کی نشست کلام کو جاذب سامعہ بنانے میں معین و مددگار ہے۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تو مرزا ارشد جوان دونوں چوٹی کے شاعر سمجھے جاتے تھے، تڑپ گئے اور کہتے لگے میاں صاحبزادے سبحان اللہ! اس عمر میں یہ شعر! طالب علمی کے زمانے میں آپ کی شاعری کی دھوم مچھ گئی تھی۔ ۱۸۹۹ء کے انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں ''نالۂ یتیم'' کے عنوان سے ایک درد انگیز نظم پڑھی۔ جس سے آپ عوام میں مقبول ہونے لگے۔ آپ کی شاعری میں اصلاحی اور مصلحانہ رنگ غالب ہے۔ حالؔی نے جس قسم کی شاعری کا آغاز کیا تھا۔ اقبالؔ نے اسے بام عروج پر پہنچادیا۔ پی۔ ایچ ڈی کے مقالہ کے علاوہ آپ کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔

اسرار خودی ۱۹۱۵ء، رموز بیخودی ۱۹۱۸ء، پیام مشرق ۱۹۲۳ء، بانگِ درا ۱۹۲۴ء، زبور عجم ۱۹۲۷ء خطبات مدراس ۱۹۳۰ء جاوید نامہ ۱۹۳۲ بال جبرائیل ۱۹۳۵ء، پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق ۱۹۳۶ء، ضرب کلیم (۱۹۳۶ء

مسافر ۱۹۳۶ء اور ارمغان حجاز ۱۹۳۸ء۔

علامہ اقبال کی نعتیہ شاعری میں حالؔی کی نعتیہ شاعری کے تمام عناصر درخشاں وتاباں نظر آتے ہیں۔آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ شیفتگی تھی۔اور آپ رسول اللہ صلعم کے متعلقات ومنسلکات سے عاشقانہ قلبی لگاؤ رکھتے تھے۔مولانا عبدالسلام نے درست لکھا ہے کہ:

''ڈاکٹر صاحب کے دل میں رسول اللہ صلعم کی محبت الٰہی پر غالب آ گئی تھی۔
ان کی آخری آرزو فریضۂ حج کی ادائیگی تھی۔لیکن اس آرزو کی محرک دیار
حبیب کی زیارت تھی۔''

علامہ کی دونوں تمنائیں پوری نہ ہوسکیں۔لیکن آپ نے عالم اشتیاق وعالمِ خیال میں سفرحج اور دیار حبیب کی تمام منزلیں طے کرلی تھیں۔آپ نے عالم خیال میں مکہ سے مدینہ کی طرف روانگی کے وقت واضح طور پر کہہ دیا تھا۔

تو باش اینجا و باخاصاں یا منیر
کہ من دارام ہوائے منزل دوست

آپ کی تمام شاعری کا محور تعلیمات نبی ہیں۔اور اسی طرح آپ کے تمام شعری سرمایہ میں روح نعت معمور ہے۔جس شاری کا آغاز حب وطن اور حب قوم سے ہوا۔اس کا اختتام حب الٰہی اور عشق رسولؐ پر ہوا۔آپ کا نعتیہ کلام جوش وخروش، وارفتگی، خلوص، والہانہ پن، اور سوز وگداز کا ایسا دلاویز مرقع ہے، جس کی نظیر اردو فارسی شاعری میں کم ملتی ہے۔

اقبال کی شاعری میں نعتیہ عناصر بکثرت منتشر نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنی تعلیمات وپیغامات کا مرکز رسول اکرم صلعم کی ذات گرامی کو بنایا ہے۔ان کی غیر رسمی نعتوں کے بعض اشعار اکثر رسمیہ نعتوں پر بھاری ہیں۔تاریخ اسلام پر ان کی نظر اتنی گہری ہے کہ وہ مبسوط سے مبسوب واقعہ کو دو مصرعوں کی ننھی سی بساط میں دکھلا کر شعر میں استعابیت، اور دلآویزی پیدا کرتے اور اس کے حسن کو دوبالا کرتے نظر آتے ہیں۔''سرگذشت آدم'' کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کبھی میں غار حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جام آفریں میں نے

شاعر عاشقین رسولؐ کے تذکرے میں اس قدر مست وسرشار ہوجاتا ہے کہ وہ ان کے ایک ایک واقعہ اور ان کی ایک ایک کیفیت سے لذت اندوزی کرتا دیکھا جاتا ہے۔''نظم بلال'' کے چند اشعار ہدیہ ناظرین ہیں:

مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا

روائے دید سراپا نیاز تھی تیری　　کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی　　نماز اس کے نظارے کا ایک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کے دیدار عام تھا اس کا

''صدیق''، نظم میں حضرت ابوبکر کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شیفتگی اور آپ کا وفور عشق ایک تاریخی واقعہ کا سہارا لے کر دکھلایا گیا ہے۔ اس نظم کا کلیدی شعر ہے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

بانگِ درا میں شامل نظم ''ایک حاجی مدینہ کے راستے میں''، عشق کے جذبہ سے سرشار ہے۔ سفر حج کا راہی کس قدر خلوص اور دل کی گہرائیوں سے کہتا ہے۔

خوف کہتا ہے کہ ''یثرب کی طرف تنہا نہ چل''　　شوق کہتا ہے کہ ''تو مسلم ہے بیباکانہ چل''
بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤنگا کیا　　عاشقوں کو روز محشر منھ نہ دکھلاؤ نگا کیا

اقبال کے نزدیک معراج کی رات صرف ایک واقعہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ ایک پیغامبر کے منصب پر فائز ہے۔ جو علو ہمتی کا درس دیتی ہے۔ ''بانگ درا'' میں شامل ''شب معراج''، نظم کا درس ملاحظہ ہو۔

اختر شام کی آتی ہے فلک سے آواز　　سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرش بریں　　کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

''ضرب کلیم''، میں معراج کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی ہے، اس میں پیغام معراج کی ترجمانی اس طرح کی گئی ہے۔

دے ولولۂ شوق جسے لذّت پرواز　　کرسکتا ہے وہ ذرّۂ مہ مہرکو تاراج!
مشکل نہیں یاران چمن ! معرکہ باز　　پرسوز اگر ہو نفسِ سینۂ دراج
ناوک ہے مسلماں ! ہدف اس کا ہے ثریا　　رہے سرّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج
تو معنی والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا　　ہے تیرا مدّو جزر ابھی چاند کا محتاج

اقبال نے اسی فلسفۂ معراج کو غزل کے صرف ایک شعر میں کس قدر موجز اور دلاویز انداز میں نظم کیا ہے۔

عشق کی ایک جست نے کردیا قصۂ تمام
اس زمیں وآسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

اقبال کی شاعری میں ''فلسفۂ خودی'' کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ان کے اس فلسفہ خودی کے عناصر ترکیبی میں عشق رسولؐ کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔خودی جب ارتقائی منازل سے گزر کر رسول کریم صلعم کی محبت سے سرشار ہوجاتی ہے۔تو کائنات کی تمام قوتیں اس کے قبضۂ قدرت کے زیر نگیں نظر آتی ہیں۔شاعر نے اسوۂ محمدی اور خلق عظیم کو آئین فطرت سے تعبیر کیا ہے۔خودی کے ذریعہ فلسفۂ حیات کی تفسیر دین فطرت اور دین محمدی کی شاعرانہ تعبیر ہے۔ماقبل کی معروضات سے یہاں کہ اقبال کو اردو کی نعتیہ شاعری میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔

○○○

ڈاکٹر نفیس حسن

خضرِ راہ کی بانگِ درا

شعروادب اورفکروپیام کے جہانِ تازہ میں مطالعہ وتفہیمِ اقبال اہلِ دانش وبینش کے لیے موجبِ سعادت و خوش بختی ہے. اس لیے کہ یہ شاہراہ جو بظاہر 'اسرارورموز' اور خضرِ راہ کی بانگِ درا سے 'بالِ جبریل' ضربِ کلیم بشمول فارسی مجموعہ ہائے کلام وخطبات وغیرہ سے گزرتی ہوئی 'ارمغانِ حجاز' تک کا سفر طے کرتی ہے. لیکن کل نوعِ انسانی بالخصوص ملّتِ اسلامی کو مستقل غور وفکر اور رو بہ عمل کرنے کے لیے ارمغانِ بدیع بھی دے جاتی ہے 2022.ء میں "خضرِ راہ کی ایک صدی" کی یہ سُرخیِ جلی اقبال کے فکروپیام سے ہمارے رشتہءدیرینہ کی دلیل ہے . نیز یہ باور کرانے کے لیے بھی کہ اقبال کی معنویت آج بھی بدستور ہے . اور مطالعہءاقبال کی تازہ کاری خود ہمارے فکروشعور اور جذبہ واحساس کی جِلا ہے. ع اک تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے گیارہ بند اور 85 اشعار سے مرصّع 1921 یا 1922 کی یہ طویل نظم میرے خیال میں 'خضرِ راہ' کی بانگِ درا اور اقبال کے فکروپیام کا دورانیہ یا دوراہا ہے. یعنی ان افکار کی جھلک ماقبل بھی ہے اور مابعد تو ان کے افکار وتصوّرات کے نوع بہ نوع خوشے جابجا نت نئے رنگ ومہک کے ساتھ ہر چشمِ بصیرت اور قلبِ سلیم کو سیراب کرتے نظر آتے ہیں. خضرِ راہ کو اس دورانیے کا دُرّناب کہا جاسکتا ہے. اس لیے کہ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں جو نقطہءعروج ہے خضرِ راہ اسی مینارِ بلند کا جزوِاعظم ہے. ہم خوب واقف ہیں کہ 'خضرِ راہ' (1922) بیسویں صدی کی دو دہائیوں پر محیط مشرق ومغرب کی سیاسی کشمکش وآویزش سے برآمد عالمی صورتِ حال اور اس سے مرتّب شدید تر اثرات کی ترجمان ہے. انسانی تاریخ کے اس موڑ پر جنگِ بلقان (1913) اور پہلی جنگِ عظیم (1914) کے بعد 1919 میں برّاعظم ایشیا ویورپ وافریقہ کی عظیم سلطنتِ عثمانیہ کا چراغ گُل اور اسی کے ساتھ خلافت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے. بلادِ اسلامیہ کی عظمتِ گزشتہ کی تاریخ جو پیران و پاسبانِ حرم کی کم نگاہی وناقبت اندیشی سازشِ مغرب اور مغرب زدگی کا شکار ہوکر ناموسِ دینِ مصطفیٰ کی قبا کے چاک ہوجانے کا بھی ذریعہ بنی' ہر حسّاس دل کو متاثّر کرتی ہے. شاعر کا پُرسوز وحسّاس اور دردمند دل ان حالات کا محض تماشائی کیسے رہ سکتا۔

خضرِ راہ' اس منظر نامہ کی محض تفسیر نہیں خوش آیند مستقبل کا اشاریہ بھی ہے ۔ آج بھی عالمی سطح پر بالخصوص عالمِ اسلام کے منظر نامہ میں ہم جس کرب سے دوچار ہیں گو کہ اس کی نوعیت قدرے مختلف ہے لیکن باطل نت نئے پیرہن اور آتش و آہن کے ساتھ زور آور ہے ۔ فطرتِ اسکندری کا جنون جاری ہے ۔ آج بھی مغرب زدگی اور اس سے مرعوبیت کے بہتے دھارے میں ہم ذہنی غلامی کے کسی نہ کسی درجہ میں تر دامن ضرور ہیں. ملک و بیرونِ ملک رات دن کے جو واقعات ہیں ہم ہر پل کسی نہ کسی آزمایش وستم رانی سے دوچار ہیں ۔ اب تو خود سرزمینِ حرمِ پاک کے قرب میں ہی ناموسِ دینِ مصطفیٰ کا کون سا گوشہ ہے جو تار تار نہیں ۔ کیا یہ سب حالات ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے کافی نہیں ۔ خضرِ راہ کی یہ بانگِ درا آج بھی ہر حسّاس اور صاحبِ شعور کے لیے قوموں کی بے توفیقی وشرمناکی کا المیہ بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے قلب وذہن کی کی آبیاری، روح کی بیداری اور قوم وملت کی تعمیرِ نو کا وسیلہ بھی ۔کون ہے جو آج بھی اس پُرسوز نوا سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے اور یہ نوا اس کی فکر وروح کو مہمیز نہ کرے بیچتا ہے ہاشمی....

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

ہم جانتے ہیں کہ مکالمہ وتمثیل' تلمیح وتلمیع ' تشبیہ واستعارہ' رمز وایما وکنایہ وغیرہ اقبال کے فکری وشعری اسلوب کے بنیادی اجزاء ہیں ۔ اقبال کی تمثیل کا جہاں بھی ان کے جہانِ فکر کی وسعت ورفعت کی بیکرانی کا پتا دیتا ہے. خضرِ راہ کے تمثیلی پیرایے میں تمہید وآغاز کے پس منظر میں منظر کشی کی فضا بھی شاعر کے قلب وذہن کی شدید کیفیات اور نظم کے موضوع کی مظہر ہے. ساحلِ دریا پر رات کی پُرسکوت فضا میں اپنے دل میں جہانِ اضطراب چھپائے شاعر کا محوِ نظر ہونے کا یہ منظر بھی اس دور کے سکوت 'جمود وتعطّل' بے حسی و بے عملی' غفلت وظلمت 'حکمتِ مغرب کی فسوں کاری ومغرب زدگی کی عکّاس ہے. عالمِ خیال میں حضرتِ خضر کی تمثیل جویائے اسرارِ ازل اقبال کے استعجاب واستفسار کا وسیلہ بن کر رونما ہوتی ہے ۔ شاعر صحرانوردی' زندگی کا راز واعجاز اپنے عہد کی مغربی آمریت کے مختلف مظاہر سلطنت ملوکیت وطنیت سرمایہ داری ومحنت کی آویزش وغیرہ نیز دنیائے اسلام کی زار وزبوں حالت اور ان کے اسباب وعِلل اور حل کا خواستگار ہوتا ہے ۔ علمِ لدنّی سے متصف حضرتِ خضر کے امتیازی وصف کو جسے قرآن مجید کی سورۃ الکھف کی آیات 65 تا 82 میں حضرت موسیٰ وحضرتِ خضر کی ملاقات کے واقعہ کے ذیل میں بیان کیا گیا

ہے'اقبال نے اسے کشتیِ مسکین'جانِ پاک اور دیوارِ یتیم کی تین بلیغ و جامع لفظی تراکیب میں پیش کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس کے استعجاب اور استفسار کے لیے خضر سے بہتر و بلند اور کون سی شخصیت ہوسکتی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان حقائق تک کو اجاگر کرنے کا وصفِ خاص عطا کیا ہے جو ابھی پردہء وجود میں ہیں. جن کے ہنگامے ابھی عالمِ وجود میں ظہور پذیر نہیں ہوئے . خضر کی تمثیل کے اس پیکر میں خود اقبال کی عظمتِ فکر اور ان کے جہانِ علم و آگہی کا اعتراف کرنا ہمارے لیے آسان ہوجاتا ہے.

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامیا بھی دریا میں سوتے ہیں خموش
کشتیِ مسکین جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

خضر کا پیکِ جہاں پیما اور شاعر کا جویائے اسرارِ ازل پیکر ہمیں آج بھی اس حقیقت سے روشناس کراتا ہے کہ حیاتِ انسانی قوتِ تسخیر کو بروئے کار لانے کے لیے ہے . وسخّر لکم مافی السمٰوات والارض . اور ہم نے تمھارے لیے مسخّر کر دیا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے . اس لیے انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ جویائے اسرارِ ازل ہو. چشمِ جہاں بیں سے کام لے. اقبال نے جگہ جگہ ہمیں یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے.

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مغربی استعماریت وخوں ریزیکے عالمی منظر نامہ بالخصوص دنیائے اسلام اور امّتِ مسلمہ کے خوں ریزی کے ان المناک حالات میں اقبال کا خضر سے زندگی کا راز و نیاز جاننے اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کا استفسار شدّت سے ابھر آتا ہے. یوں تو زندگی سے متعلق اقبال کے تصوّرات ان کے کلام میں متعدد جگہ نئے اسلوب و آہنگ میں دیکھے جاسکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ خضرِ راہ کا تیسرا چوتھا اور پانچواں بند اقبال کے فلسفہء حیات کا جوہر ہے . زندگی اور اس کے اعجازات کی جو تعبیریں بیان کی گئی ہیں وہ بشریت کی معراج ہیں . صحرانوردی 'سفرِ مسلسل' حرکت وعمل' گردشِ پیہم' سعی وجستجو' آرزوئے پیہم' برتر از سود وزیاں وزمان ومکاں' روز وشب اور امروز وفردا کی تقویم سے ماوراء' قوتِ تسخیر اور جہانِ نو کی تخلیق وتعمیر' ضمیرِ کُن فکاں' فطرتاً آزاد' بحرِ بیکراں' جاوداں اور بقا کی حامل صفات واوصاف سے متّصف پیکرِ خاکی ہی زندگی کا حامل ہے. ورنہ محض گردشِ خون کا نام تو زندگی نہیں . ہر نَفَس نَفَسِ تازہ اور ہر نقش نقشِ دوام ہی زندگی کی علامت ہے . راہِ حق وصداقت میں زندگی کو جاں سے بڑھ کر تسلیم

جاں بننے کے لیے پیکرِ خاکی میں جان پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے. زندگی کو ان مختلف النوع صفات سے مزیّن کرنے اور رضائے حق و سرفرازی کی طلب کے لیے نالہء شب گیرے اور آہِ سحر خیزی سے رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرنے کی ضرورت بیان کی جاتی ہے . حیات و کائنات کے اس زیاں خانے میں ہر دم محشر بپا ہے اور عالمِ محشر میں سرخ روئی دفترِ عمل کے بغیر ممکن نہیں . زندگی کے راز 'حقیقت' ماہیت اور اس کے اعجاز کا یہ عظیم و بلند تر تصوّر کیا کسی خاص دور کسی خاص مقام اور کسی خاص طبقہء انسانی کے لیے محدود ہوسکتا ہے . آج سو سال بعد بھی اقبال کے یہ احساسات کسی بھی شرر کو شعلہ ساماں بنانے اور پیکرِ خاکی میں انقلابی روح پھونکنے کی پوری قوت اپنے اندر رکھتے ہیں:

زندگی کی قوتِ پنہاں کو کردے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سِرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
سوئے گردوں نالہء شب گیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاوں میں اپنے رازداں پیدا کرے

سلطنت کے استفسار کے جواب میں آمرّیت کے جبر و استبداد کی تصویر قرآن مجید کی سورۃ النمل کی آیۃ: 34 ان الملوک کے حوالہ سے پیش کی جاتی ہے. اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَا اَذِلَّۃ . ("جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں تباہی مچا دیتے ہیں. اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں") اقوامِ غالب کے حکمراں اپنی جادوگری کی ساحری سے محکوم کو اپنی غلامی کے سحر میں غرق کر دیتی ہے۔ان پر غلامی کے سحر کا اثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ غلام کی زنجیر کو بھی سازِ دلبری سمجھ لیتے ہیں۔آمریّت (Imperialism) اور اس کے مفاسد کے بالمقابل الارض للہ الملک للہ (زمین بھی اللہ کی اور ملک و ملکیت سب کچھ بھی اسی کا.) اسلامی تصور پیش کیا جاتا ہے . سروری و حکمرانی کے شایانِ شان بس اللہ ربّ العزت کی ذاتِ بے

ہمتا ہے. حقیقی حکمراں وہی ہے اس کے علاوہ باقی سب جو بھی دعویِ حکمرانی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال نے سلطنت و حکمرانی کے ضمن میں مغربی آمریّت کی مختلف شکلوں ملوکیت' وطنیت' قومیت' اور سرمایہ داری وغیرہ کے مقابلہ میں انقلابِ روس 1917ء کے نتیجہ میں بطنِ گیتی سے پیدا آفتابِ تازہ جمہوری نظام کو بنظرِ استحسان ضرور دیکھا تھا لیکن ان سب کے مفاسد اور اسلام کے نظامِ عدل وانصاف کی منفرد خصوصیات کے آگے جمہوری نظام سے بھی اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا. اس لیے کہ جمہوری قبا میں بھی دیوِ استبداد کا نظارہ ہے جسے نادان عوام آزادی کی نیلم پری تصور کرتے ہیں . مزید یہ کہ جمہوری طرزِ حکومت کی مجلسِ قانون ساز (Legislative Assembly) میں عوامی فلاح و بہبود کی خواہ اصلاحی کوششیں ہوں یا ان کے حقوق کی بات' یا عوام کے کسی طبقہ کو دی جانے والی مراعات ورعایات کے معاملات اور ان سب کے متعلق لمبی چوڑی بحثیں ہوں' یہ سب سرمایہ داروں کی شاطر چالیں اور محض جھوٹی تسلیاں ہیں' اصل مقصد تو عوام کو اپنے دامِ فریب میں الجھائے رکھنا ہے. جہاں تک اکثریت کی بنیاد پر لیے گئے فیصلوں کی بات ہے' وہ تو فقط تعداد کا بھنڈار ہوتے ہیں' حق وانصاف کا معیار نہیں . بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے . مزید یہ کہ اقبال اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ حکمیت جمہوریت میں خواہ عوام کی ہو اور ملوکیت میں سلطان کی' حاکمیت کا یہ تصور تو سراسر قانونِ الٰہی کے خلاف ہے . اس لیے کہ حاکمیت تو بس اللہ ہی کی ہے۔ سلطنت اور مختلف نظام ہائے سلطنت وحکومت سے متعلق یہ تصورات مزید صراحت کے ساتھ 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' نظم میں اپنے نقطۂ عروج کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ خضرِ راہ تو ان تصورات کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مغربی آمریت انسانی استحصال اور طلسمِ سامری کے تراشے ہوئے رنگ ونسل' قومیت ووطنیت' اور تہذیب وثقافت وغیرہ کے یہ بت آج بھی دنیا کی قوموں پر چھائے ہوئے ہیں' جنھوں نے انسانی وحدت' احترام وعظمت' مساوات واُخوت: حُرّیت اور انسانی فلاح کے تصور اور مقصدِ عین کو پارہ پارہ کرکے رکھ دیا ہے . بلاشبہ خضرِ راہ کی یہ بانگِ درا رحیلِ کارواں کے لیے آج بھی نغمۂ بشارت اور دعوتِ فکر وعمل ہے .

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں کا عالمی منظر نامہ بالخصوص دنیائے اسلام کی تاریخ کا جو آئینہ ہم خضرِ راہ کے آخری تین بند میں دیکھتے ہیں تو آج بھی بے ساختہ ہماری نظروں کے سامنے تاریخ کے وہ داغ ابھرنے لگتے ہیں جو سوز و ساز سے لبریز ہیں۔ پورے عالمِ اسلام کی میراثِ خلیل تثلیث کے فرزندوں (عیسائیوں) کے ہاتھ لگ گئی. خاکِ حجازِ مقدس خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی. ناموسِ دینِ مصطفیٰ پامال ہوگئی۔ کلاہِ لالہ رنگ رسوا ہوگئی . مغربی تہذیب و معاشرت کے نقش و نگار چمکنے لگے۔ حکمتِ مغرب کے قومیت و وطنیت کے دامِ فریب کے سبب مشرق کا شیرازہ سونے ٹکڑوں کی طرح بکھر گیا. خونِ مسلم کی اس ارزانی پر قلب و روح کا اضطراب فطری لیکن تاریخ کے اس المیہ کی داستان چشمِ عبرت اثر کو دروں بینی اور خود احتسابی کی دعوت دیتی ہے۔ وحدتِ ملّی اور ملّتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید' تعمیرِ نو' شیرازہ بندی اور نشاطِ ثانیہ کے لیے کمر بستہ ہونے کا لائحۂ عمل پیش کیا جاتا ہے۔ اغیار کی گداگری سے دامن پاک کرنے' ربط و ملّتِ بیضا کا پیکر بننے' ملک و دولت سے بے نیاز ہوکر حصارِ دین میں داخل ہونے' پاسبانیِ حرم اور اسلامی نظام کی بالادستی کے لیے عالمی اتّحادِ ملّی قایم کرنے' رنگ و خون' نسل و قوم کے امتیاز' مسلکی اختلاف اور فروعی بحثوں کے مفسدات اور خطرات سے آگاہ ہونے' اسلاف کے لائحۂ عمل اور طرزِ حیات کو پورے عزم و یقین اور قلب و جگر سوزی کے ساتھ اختیار کرنے اور خلافتِ راشدہ کے اسلامی عدل و انصاف کی بازآفرینی کے لیے میدانِ عمل میں آنے کا جو عظیم پیغام دیا جاتا ہے وہ آج بھی ہمارے لیے اتنا ہی ضروری اور اہم ہے.

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر

ہم جانتے ہیں کہ اقبال کے اسلوبِ فکر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہزار حزن و ملال اور افسردگی و

پژمردگی کی فضا میں بھی وہ امید و یقین کا دامن نہیں چھوڑتے . وہ ہمیشہ ظلمتِ شب میں صبحِ روشن کا ایقان' خونِ صد ہزار انجم سے ہی طلوعِ سحر کی نمود اور مئے نشاط کے مژدہء جاں فزا سے لبریز ہوتے ہیں. اور یہ یقینِ کامل رکھتے ہیں کہ اگر ہم اسلام کے نسخہء کیمیا قرآن وسنت پر گامزن ہوں اور جصارِ دین میں داخل ہوں تو دنیا کے یہ تمام ابلیسی نظام اور طاغوتی قوتیں اسلام کے حق وصداقت حریت ومساوات واخوت اور انسانی احترام وعظمت کے لازوال پیام کے سامنے اپنے انجام کو پہنچیں گی. مادیت پرستی کے سیلِ رواں میں مغربی اقوام اور تمام باطل قوتوں کے عروج کے اس منظر نامہ میں ان کے خاتمہ کے آثار وعلایم کی پیش بینی بھی کی جاتی ہے۔اور امید کی جاتی ہے کہ یقیناً یہ مردِ خفتہ مردِ مسلمان جوہرِ ایّام خدا کا آخری پیغام بن کر زمانے کے افق پر نمودار ہوگا اور اسلام کے نغمہء توحید سے چمنِ عالم معمور ہوکر رہے گا۔فریاد کی تاثیر اور حریتِ اسلام کے خواب کی تعبیر رونما ہوگی۔بشرطیکہ مردِ مسلمان کا دل آرزو سے آباد رہے . سینہء مردِ مسمان کو آرزو سے آباد رکھنے اور ہر زماں کلامِ الٰہی کا یہ فرمان کہ بے شک اللہ کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا .انّ اللہ لایخلف المیعاد . کو یاد رکھنے کا یہ پیام آج بھی قوموں کے تنِ مردہ میں موجِ حیات دوڑانے کے لیے نسخہء کیمیا ہے.

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

مختصر یہ کہ خضرِ راہ اقبال کے فکر و پیام کا نقطہء ارتکاز'ان کے وسیع وبلند تر تصورات اور پیغامِ نو کا نہایت جامع وبلیغ پیش لفظ ہے. استاذی پروفیسر عبدالحق صاحب کا یہ احساس بھی موضوع کے حسبِ حال ہے.

"خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام ساکنانِ ارضی کے استحصال اور خوش آیند دنوں کے استقبال سے عبارت ہیں . اقبال کے شعری اور فکری تصورات کی تفہیم میں ان دونوں کا سیاق ولحاق ایشیا کی بیداری کا باگِ درا بن گیا ہے. (اقبال شاعرِ رنگیں نواص15)

○○○

عارف حسن خان
علی گڑھ

''بالِ جبریل'' کی غزلیات کا شعری آہنگ: ایک تجزیاتی مطالعہ

اقبالؔ کی شاعری میں فکری اور فلسفیانہ عناصر اس طرح گھلے ملے ہیں کہ اکثر اُن کی شاعری کے مطالعے کے دوران ناقدین کی توجہ اُن کی شاعرانہ خوبیوں کے مقابلے میں اُن کی فکر اور فلسفے پر زیادہ مرکوز رہتی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اصل سروکار شاعر اقبالؔ سے ہے، مفکر یا فلسفی اقبالؔ سے نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کی شاعری کے مطالعے کے دوران اُن کی فکر اور اُن کا فلسفہ بھی ہمارے پیشِ نظر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کی فکر پر جس کثرت سے لکھا گیا ہے اُس کے مقابلے میں اُن کی شاعرانہ خوبیوں پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

اردو شاعری میں اقبالؔ کی شناخت ایک عظیم نظم نگار کی حیثیت سے کی جاتی ہے اور بلاشبہ اس میدان میں اُن کا کوئی حریف نہیں۔ لیکن اقبالؔ کی غزل بھی اُن کی نظم سے کسی طرح کم نہیں اور اس کی بھی اپنی الگ شناخت ہے۔ غزل کے سب سے بڑے دو شاعروں یعنی میرؔ اور غالبؔ کے بعد اقبالؔ کا اس صنف میں بھی کوئی مقابل نہیں۔ مزید برآں جس طرح میرؔ اور غالبؔ اپنے اپنے انداز میں منفرد ہیں، اسی طرح اقبالؔ کی غزل کا انداز بھی سب سے الگ اور منفرد ہے۔

اقبالؔ کے پہلے شعری مجموعے بانگِ درا میں، جو تین حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصّے میں ۱۲، دوسرے میں ۷ اور تیسرے میں ۸، اس طرح کُل ۲۷ غزلیں ہیں۔ ان غزلوں کے انداز اور ان کے آہنگ میں ہمیں کوئی ایسا نمایاں وصف نظر نہیں آتا، جسے اقبالؔ کے ساتھ مخصوص کیا جا سکے یا جسے اُن کی انفرادیت قرار دیا جا سکے۔ اگرچہ تیسرے دور کی بعض غزلوں میں کہیں کہیں ایسے اشعار نظر آتے ہیں، جو آئندہ اُن کی غزل کے اسلوب میں ہونے والی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ دراصل اقبالؔ کی بہترین غزلیں اُن کے دوسرے اردو شعری مجموعے ''بالِ جبریل'' میں شامل ہیں۔ اس مضمون میں انھیں غزلوں کے آہنگ کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اقبالؔ کے اس شعری مجموعے کی کسی تخلیق پر اگرچہ غزل تحریر نہیں، لیکن اس کے آغاز میں (۱) سے (۱۶) اور پھر (۱) سے (۶۱) تک جو تخلیقات شامل ہیں اُن میں سے بیش تر (یعنی دو تین تخلیقات کو چھوڑ کر) سبھی غزلیں ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ اوّل (۱) سے (۱۶) تک شامل تخلیقات میں سے پانچویں تخلیق غزل کے دائرے میں نہیں آتی ہے کیوں کہ پانچ اشعار پر مشتمل اس تخلیق کے چار اشعار ایک زمین میں ہیں اور پانچواں شعر دوسری زمین

میں۔اسی طرح سولہویں تخلیق کو بھی غزل کہنے میں تامّل ہے، یہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے قطعہ ہے۔ پھر دوبارہ (۱) سے (۶۱) تک جو تخلیقات شاملِ کتاب ہیں اُن میں سے پہلی تخلیق جو حکیم سنائی غزنویؒ کے قصیدے کی پیروی میں کہی گئی ہے، قصیدے ہی کے دائرے میں آتی ہے۔اسی طرح تخلیقات نمبر ۵۱، ۵۸ اور ۵۹ درحقیقت قطعات ہیں۔ چناں چہ ان ۷۷ (۱۶+۶۱) تخلیقات میں سے دراصل ۱۴+۵۱ = ۶۵ تخلیقات ہی صحیح معنی میں غزل ہیں۔اس مطالعے کو انھیں ۶۵ تخلیقات تک محدود رکھا جائے گا۔

غزل کے آہنگ کا انحصار اس کے وزن اور ردیف وقوافی (یعنی اس کی زمین) پر ہوتا ہے۔ ہر شاعر اپنی شاعری کے لیے بے شمار اوزان میں سے اُن چند اوزان کا انتخاب کرتا ہے، جو اس کے مزاج اور اس کی پسند کے مطابق ہوتے ہیں۔مختلف بحور و اوزان میں طویل مصوّتوں کے استعمال کی زیادہ سے زیادہ گنجایش اور مختصر مصوّتوں کے کم سے کم استعمال کی لازمی تعداد اور طویل و مختصر مصوّتوں کی باہمی ترتیب و تناسب ان کے آہنگ میں امتیاز کا سبب بنتے ہیں۔انھیں کا تناسب اور ترتیب مختلف اوزان میں پائی جانے والی موسیقیت اور ترنّم کا باعث ہوتے ہیں۔

شعر کا آہنگ تو پوری طرح سے بحر و وزن کے تابع ہوتا ہی ہے، اُس کی لفظیات بھی وزن اور اُس کے ساتھ ساتھ ردیف وقوافی سے متاثر ہوتی ہے۔کبھی ردیف وقافیے کی صرفی حیثیت پورے شعر کے الفاظ کو متاثر کرتی ہے، تو کبھی مصرعے کی نحوی ساخت الفاظ کی جس ترتیب کا مطالبہ کرتی ہے، وہ بحر کے سانچے میں صحیح نہیں بیٹھتی اور مصرع کو بحر و وزن کے مطابق کرنے کے لیے اُس میں کاٹ چھانٹ ضروری ہو جاتی ہے۔کبھی مصرع میں ایک لفظ کا استعمال ناگوار یا غیر فصیح محسوس ہوتا ہے، لیکن اس کے ہم معنی دوسرا لفظ رکھنے پر (جو اگرچہ فصیح ہے) مصرع موزوں نہیں رہتا۔ چناں چہ اس ایک لفظ کو بدلنے کے لیے کئی دوسرے الفاظ کو، بلکہ کبھی کبھی پورے مصرعے کو ہی بدلنا پڑ جاتا ہے۔اس طرح بحر و وزن اور قافیہ و ردیف کا انتخاب کسی شاعر کے مزاج اور اُس کے شعری آہنگ کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔

آئندہ سطور میں ''بالِ جبریل'' کی غزلیات میں استعمال ہونے والے بحور و اوزان اور ردیف وقوافی کا ایک تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اُن کی غزلیات کے شعری آہنگ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔تو آیئے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ ''بالِ جبریل'' کی غزلوں کے لیے اقبالؔ نے کون کون سے اوزان کا انتخاب کیا ہے اور ان اوزان میں کہے گئے اشعار کا کیا تناسب ہے:

۱۔بحرِ ہزج:

(۱) ہزج مثمن سالم (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن دوبار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار

۱۔ اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میر ۵

۲۔ پریشاں ہوکے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جومشکل اب ہے یارب پھروہی مشکل نہ بن جائے ۶

۳۔ دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرّہ میں غوغاے رستاخیز ہے ساقی ۷

۴۔ متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی ۷۔

۵۔ مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسنِ عالم گیر ہے مردانِ غازی کا ۶

۶۔ دلِ بیدارِ فاروقی، دلِ بیدارِ کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری ۷

۷۔ زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی ۵

۸۔ خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے ۶

۹۔ مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا ۶

۱۰ نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے یہی طغیانِ مشتاقی ۷

۱۱۔ یہ پیرانِ کلیسا و حرم ! اے وائے مجبوری
صلہ ان کی کد و کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری ۷

کل اشعار ۶۹

(۲) ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف/مقصور (مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن/فعولان)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے	۷
۲۔	پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی	۵
۳۔	فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک	۴
کل اشعار		۱۶

(۳) ہزج مربع اخرب سالم/مسبّغ مضاعف (مفعولُ مفاعیلن/ مفاعیلان مفعولُ مفاعیلن/ مفاعیلان دوبار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	اِک دانشِ نورانی، اِک دانشِ برہانی ہے دانشِ برہانی، حیرت کی فراوانی	۷
۲۔	یہ کون غزل خواں ہے، پُرسوز و نشاط انگیز اندیشۂ دانا کو، کرتا ہے جنوں آمیز	۷
۳۔	یہ دیرِ کہن کیا ہے؟ انبارِ خس و خاشاک مشکل ہے گذر اس میں، بے نالۂ آتش ناک	۷
۴۔	افلاک سے آتا ہے، نالوں کا جواب آخر کرتے ہیں خطاب آخر، اُٹھتے ہیں حجاب آخر	۷
۵۔	جب عشق سکھاتا ہے، آدابِ خود آگاہی کھُلتے ہیں غلاموں پر، اسرارِ خود آگاہی	۶
۶	یوں ہاتھ نہیں آتا، وہ گوہرِ یک دانہ یک رنگی و آزادی، اے ہمّتِ مردانہ	۶
کُل اشعار		۴۰

(۴) ہزج مسدّس اخرب مقبوض محذوف (مفعولُ مفاعلن فعولن دوبار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	ہر چیز ہے محوِ خود نمائی ہر ذرّہ شہیدِ کبریائی	۸
۲۔	فطرت کو خرد کے روبرو کر تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کر	۵
	کُل اشعار	۱۳

بحرِ ہزج میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد=۶۹+۱۶+۴۰+۱۳ =۱۳۸

۲۔بحرِ رجز:

(۱)رجز مربع مطوّی مخبون/مخبون مذال مضاعف (مفتعلن مفاعلن/ مفاعلان مفتعلن مفاعلن/ مفاعلان دوبار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	میری نوائے شوق سے، شور حریمِ ذات میں غلغلہ ہائے الاماں، بتکدۂ صفات میں	۵
۲۔	گیسوے تاب دار کو، اور بھی تاب دار کر ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر	۸
۳۔	عالمِ آب و خاک و باد، سرِّ عیاں ہے تو کہ میں وہ جو نظر سے ہے نہاں، اُس کا جہاں ہے تو کہ میں	۴
۴۔	تو ابھی رہ گذر میں ہے، قیدِ مقام سے گذر میرِ سپاہ مصر و حجاز سے گذر، پارس و شام سے گذر	۵
۵۔	میرِ سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف آہ وہ تیرِ نیم کش، جس کا نہ ہو کوئی ہدف	۷
	کُل اشعار	۲۹

(۲)رجز مربع مطوی مرفوع/مرفوع مذال مضاعف (مفتعلن فاعلن/ فاعلان مفتعلن فاعلن/ فاعلان دوبار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	ڈھونڈ رہا ہے فرنگ، عیشِ جہاں کا دوام واے تمنّاے خام+ واے تمنّاے خام	۷
۲۔	گرمِ فغاں ہے جرس، اُٹھ کہ گیا قافلہ واے وہ رہرو کہ ہے، منتظرِ راحلہ	۵
	کُل اشعار	۱۲
	بحرِ رجز میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد	=۴۱

۳۔ بحرِ رمل:

(۱) رمل مثمن محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن دوبار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں	۶

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۲۔	پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن مجکو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن	۹
۳۔	عشق سے پیدا نواے زندگی میں زیر و بم عشق سے مٹّی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم	۵
	کُل اشعار	۲۰

(۲) رمل مثمن مخبون محذوف/مقصور/محذوف مسکّن/مقصور مسکّن

(فاعلاتن/فعِلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعِلن/فعِلان/فعْلن/فعْلان دوبار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	لا پھر اِک بار وہی بادہ و جام اے ساقی ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی	۷
۲۔	تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم	۵
۳۔	مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے؟ خانقاہوں میں کہیں لذّتِ اسرار بھی ہے؟	۵
۴۔	حادثہ وہ بھی ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اُس کا مِرے آئینۂ ادراک میں ہے	۵
۵۔	کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش اِک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش	۵
۶۔	تھا جہاں مدرسۂ شیری و شاہنشاہی آج اُن خانقہوں میں ہے فقط روباہی	۵
	کُل اشعار	۳۲

(۳) رمل مثمن مشکول (فعِلاتُ فاعلاتن فعِلاتُ فاعلاتن دوبار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	تجھے یاد کیا نہیں ہے، مِرے دل کا وہ زمانہ وہ ادب گہِ محبت، وہ نگہ کا تازیانہ	۷
۲۔	وہی میری کم نصیبی، وہی میری بے نیازی مِرے کام کچھ نہ آیا، یہ کمالِ نے نوازی	۷
۳۔	یہ پیام دے گئی ہے، مجھے بادِ صبح گاہی کہ خودی کے عارفوں، کا ہے مقام پادشاہی	۷
	کُل اشعار	۲۱
	بحرِ رمل میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد=۲۰+۳۲+۲۱	=۷۳

۴۔بحرِ متقارب:

(۱) متقارب مثمن سالم (فعولن فعولن فعولن فعولن دو بار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں	۷
	کُل اشعار	۷

(۲) متقارب مثمن اثلم مقبوض مخنق سالم الآخر (فعْلن فعولن فعْلن فعولن دو بار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	ہر شے مسافر، ہر چیز راہی کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماہی	۵
۲۔	نے مہر باقی، نے مہرہ بازی جیتا ہے رومی، ہارا ہے رازی	۷
	کُل اشعار	۱۲

بحرِ متقارب میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد = ۷+۱۲ = ۱۹

۵۔بحرِ مضارع:

(۱) مضارع مثمن اخرب مکفوف مکفوف مخنق سالم الآخر (مفعولُ فاع لاتن مفعولُ فاع لاتن دو بار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ ٹوٹا ہے ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ	۷
	کُل اشعار	۷

بحرِ مضارع میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد = ۷

۶۔بحرِ مجتث:

(۱)مجتث مثمن مخبون محذوف/محذوف مسکّن/مقصور/مقصور مسکّن (مفاع لن فعِلاتن مفاع لن فعِلن/فعْلن/فعِلان/فعْلان دوبار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	اثر کرے نہ کرے سن تو لے مِری فریاد نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد	۷
۲۔	مٹا دیا مِرے ساقی نے عالمِ من و تو پلا کے مجھ کو مئے لاالٰہ الاّ ہوٗ	۷
۳۔	ضمیرِ لالۂ مے لعل سے ہوا لب ریز اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز	۷
۴۔	وہ حرفِ زار کہ مجکو سکھا گیا ہے جنوں خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں	۹
۵۔	امینِ راز ہے مردانِ حُر کی درویشی کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبتِ خویشی	۵
۶۔	ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق	۷
۷۔	یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب	۷
۸۔	خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں جو ناز ہو بھی تو بے لذّتِ نیاز نہیں	۷

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۹۔	کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری	۷
۱۰۔	خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں تو آب جو اسے سمجھا تو کوئی چارہ نہیں	۷
۱۱۔	تِری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ تِرا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ	۷
۱۲۔	خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں تِرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں	۷
۱۳۔	نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے	۷
۱۴۔	نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے	۸
۱۵۔	تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں وہ جلوہ گاہ تِرے خاکداں سے دور نہیں	۵
۱۶۔	خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ	۷
۱۷۔	خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل اگر ہو عشق سے محکم تو سورِ اسرافیل	۷
۱۸۔	رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی	۷
۱۹۔	ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک اگرچہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک	۷
۲۰۔	نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے	۷
۲۱۔	کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد مِری نگاہ نہیں سوے کوفہ و بغداد	۷

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۲۲۔	مِری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی دیا ہے میں نے انھیں ذوقِ آتش آشامی	۶
۲۳۔	ہر اِک مقام سے آگے گذر گیا مہِ نو کمال کس کو میسّر ہوا ہے بے تگ و دو	۵
۲۴۔	کمالِ جوشِ جنوں میں رہا میں گرمِ طواف خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف	۵
۲۵۔	شعور و ہوش و خرد کا معاملہ ہے عجیب مقامِ شوق میں ہیں سب دل و نظر کے رقیب	۵
	کُل اشعار	۱۶۷

بحرِ جتث میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد =۱۶۷

۷۔بحرِ خفیف:

(۱) خفیف مسدّس مخبون محذوف (فاعلاتن مفاع لن فعِلن دوبار)

نمبر شمار	غزل کا مطلع	تعداد اشعار
۱۔	عقل گو آستاں سے دور نہیں اس کی تقدیر میں حضور نہیں	۹
	کُل اشعار	۹

بحرِ خفیف میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد =۹

''بالِ جبریل'' کی غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد =۴۵۴

اس تجزیہ کی روشنی میں مختلف بحور واوزان میں کہے گئے اشعار کی تعداد وتناسب کا خلاصہ پیش ہے:

بحر ووزن	تعداد اشعار	فی صد تناسب
۱۔بحرِ ہزج:		
(۱) ہزج مثمن سالم (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن دوبار)	۶۹	۱۵ء۲۰

(۲) ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف/مقصور (مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن/فعولان)	۱۶	۳٫۵۲
(۳) ہزج مربع اخرب سالم/مسبّغ مضاعف		
(مفعولُ مفاعیلن/ مفاعیلان مفعولُ مفاعیلن/ مفاعیلان دوبار)	۴۰	۸٫۸۱
(۴) ہزج مسدّس اخرب مقبوض محذوف (مفعولُ مفاعلن فعولن دوبار)	۱۳	۲٫۸۶
بحرِ ہزج میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد و تناسب	۱۳۸	۳۰٫۴۰
۲۔ بحرِ رجز:		
(۱) رجز مثمن مطوّی مخبون/مخبون مذال مضاعف		
(مفتعلن مفاعلن/ مفاعلان مفتعلن مفاعلن/ مفاعلان دوبار)	۲۹	۶٫۳۹
(۲) رجز مربع مطوی مرفوع؟ مرفوع مذال مضاعف		
(مفتعلن فاعلن/ فاعلان مفتعلن فاعلن/ فاعلان دوبار)	۱۲	۲٫۶۴
بحرِ رجز میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد و تناسب	۴۱	۹٫۰۳
۳۔ بحرِ رمل:		
(۱) رمل مثمن محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن دوبار)	۳۰	۴٫۴۱
(۲) رمل مثمن مخبون محذوف/مقصور/محذوف مسکّن/مقصور مسکّن		
(فاعلاتن/فعِلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعِلن/فعِلان/فعْلن/فعْلان دوبار)	۳۲	۷٫۰۵
(۳) رمل مثمن مشکول (فعِلاتُ فاعلاتن فعِلاتُ فاعلاتن دوبار)	۲۱	۴٫۶۳
بحرِ رمل میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد و تناسب	۷۳	۱۶٫۰۷
۴۔ بحرِ متقارب:		
(۱) متقارب مثمن سالم (فعولن فعولن فعولن فعولن دوبار)	۷	۱٫۵۴
(۲) متقارب مثمن اثلم مقبوض مخنق سالم الآخر (فعْلن فعولن فعْلن فعولن دوبار)	۱۲	۲٫۶۴
بحرِ متقارب میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد و تناسب	۱۹	۴٫۱۹
۵۔ بحرِ مضارع:		
(۱) مضارع مثمن اخرب مکفوف مکفوف مخنق سالم الآخر		
(مفعولُ فاع لاتن مفعولُ فاع لاتن دوبار)	۷	۱٫۵۴

بحرِ مضارع میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد و تناسب	۷	۱ء۵۴

۶۔ بحرِ مجتث:

(۱) مجتث مثمن مخبون محذوف/ محذوف مسکّن/مقصور/مقصور مسکّن

(مفاعلن فعِلاتن مفاعلن فعِلن/فعْلن/فعِلان/فعْلان دو بار)	۱۶۷	۳۶ء۷۸
بحرِ مجتث میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد و تناسب	۱۶۷	۳۶ء۷۸

۷۔ بحرِ خفیف:

(۱) خفیف مسدّس مخبون محذوف (فاعلاتن مفاعلن فعِلن دو بار)	۹	۱ء۹۸
بحرِ خفیف میں کہے گئے اشعار کی مجموعی تعداد و تناسب	۹	۱ء۹۸

اس تجزیے کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اقبالؔ نے اپنی غزلیات کے لیے چند مخصوص بحور واوزان کا ہی انتخاب کیا ہے۔ یوں تو اُن کی غزلیات سات بحور کے چودہ اوزان میں کہی گئی ہیں، لیکن ان میں سے کئی اوزان تو محض برائے نام ہی استعمال میں آئے ہیں۔ مثلاً مضارع، جو اردو کی سب سے زیادہ مقبول بحر ہے، اس کے صرف ایک وزن ''مفعولُ فاع لاتن مفعولُ فاع لاتن'' میں اقبالؔ نے ۷ اشعار کہے ہیں۔ اسی طرح بحرِ خفیف کے وزن ''فاعلاتن مفاعلن فعِلن''، میں، جو اردو شاعروں کا محبوب اور پسندیدہ وزن ہے، صرف ۹ اشعار کہے گئے ہیں۔ دراصل ''بالِ جبریل'' کی غزلیات کا دو تہائی سے زیادہ حصہ صرف دو بحروں مجتث اور ہزج پر مشتمل ہے، جن کے اشعار کی مجموعی تعداد کُل اشعار کا ۲ء۶۷ فیصد ہے۔ انفرادی طور پر مجتث کے وزن ''مفاعلن فعِلاتن مفاعلن فعِلن/فعْلن/فعِلان/فعْلان'' میں سب سے زیادہ (۳۶ء۷۸ فیصد) اشعار کہے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہزج مثمن سالم ''مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن'' میں ۲ء۱۵ فیصد اشعار کہے گئے ہیں۔ دیگر اوزان میں سے جن اوزان کا استعمال نسبتاً زیادہ ہوا ہے، وہ ہیں ہزج کا وزن ''مفعولُ مفاعیلن/ مفاعیلان مفعولُ مفاعیلن/ مفاعیلان'' (۸۱ء۸ فیصد) رمل کا وزن ''فاعلاتن/فعِلاتن فعِلاتن فعِلن/فعْلن/فعِلان/فعْلان'' (۰۵ء۷ فیصد) اور رجز کا وزن ''مفتعِلن مفاعلن/ مفاعلان مفتعِلن مفاعلن/ مفاعلان'' (۳۹ء۶ فیصد)۔

بحرِ مجتث کے جس وزن میں سب سے زیادہ اشعار کہے گئے ہیں، یعنی جو وزن اقبالؔ کو سب سے زیادہ مرغوب ہے، اس میں مختصر مصوّتوں کے کم سے کم استعمال کی لازمی جگہیں اور طویل مصوّتوں کے استعمال کی زیادہ سے زیادہ گنجایش تقریباً برابر ہیں۔ چناں چہ اس کا آہنگ نہ زیادہ تیز ہے اور نہ زیادہ سست، بلکہ یہ بڑا سبک، متوازن اور دلکش ہے۔ اپنے صوتی اتار چڑھاؤ کی بنا پر یہ بیحد مترنم آہنگ ہے اور غزل کے داخلی مزاج اور جذبات کی تھمی ہوئی

کیفیات کی ترجمانی کے لیے بیحد مناسب اور موزوں ہے۔

اقبالؔ کے دوسرے پسندیدہ وزن ہزج مثمن سالم میں چوں کہ ہر رکن ایک وتدِ مجموع سے شروع ہوتا ہے، یعنی ہر رکن کا آغاز ایک مختصر مصوّتے سے ہوتا ہے، چناں چہ مصرعے کی ابتدا دھیمے سُر سے ہوتی ہے اور یہ وزن مدھم لے والا اور سبک رو ہے۔ چناں چہ یہ آہنگ شعر میں داخلیت اور سوز و گداز پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

ان اوزان کے علاوہ اقبالؔ نے اپنی غزلوں میں جن تین اوزان کا استعمال دیگر اوزان کے مقابلے میں زیادہ کیا ہے، اُن میں سے دو یعنی ہزج کا وزن ''مفعولُ مفاعیلن/ مفاعیلان مفعولُ مفاعیلن/ مفاعیلان'' اور رجز کا وزن ''مفتعِلن مفاعلن/ مفاعلان مفتعِلن مفاعلن/ مفاعلان'' شکستہ اوزان ہیں، یعنی ان میں مصرع دو حصّوں میں منقسم ہوتا ہے اور مصرعے کے ان دونوں اجزا کے درمیان ایک عروضی وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفے کی وجہ سے مصرعے کے درمیان صوتی بہاؤ ایک لمحے کے لیے رک جاتا ہے۔

ان میں سے پہلا یعنی ہزج کا وزن رکن مفعولُ سے شروع ہوتا ہے، جس میں پہلے دو اسبابِ خفیف ہیں۔ چناں چہ مصرعے کا آغاز یا تو طویل مصوّتے سے ہوتا ہے یا اگر مختصر مصوّتے سے ہوتا ہے، تو اس کی ضرب بعد کے مصمّتے پر پڑتی ہے، جس کی بنا پر شعر کا لہجہ بلند آہنگ ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرے رکن کے بعد وقفہ آ جانے کی وجہ سے اس کے بہاؤ میں رکاوٹ آ جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک بار پھر مفعولُ کے آ جانے سے شعر دوبارہ اونچے سُر سے شروع ہو جاتا ہے۔

رجز کے مذکورہ وزن میں بھی یہی صورت ہے کہ مصرعے کا آغاز سببِ خفیف سے ہوتا ہے چناں چہ شعر اونچے سُر سے شروع ہوتا ہے، لیکن اس کے فوراً بعد ہی دو متحرک آنے کی وجہ سے دو مختصر مصوتوں کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے اور بحر کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ پھر وقفے کی بنا پر ایک صوتی توقف کے بعد مصرع دوبارہ اسی انداز میں آگے بڑھتا ہے۔ اس کے باوجود بلاشبہ یہ دونوں اوزان بیحد مترنم ہیں۔

تیسرا یعنی رمل کا مذکورہ بالا وزن اپنے مزاج اور اپنی کیفیت کے اعتبار سے مجتث کے اُس وزن سے کافی قریب ہے جسے اقبالؔ نے سب سے زیادہ استعمال کیا ہے۔ اس میں بھی مختصر مصوّتوں کے کم سے کم استعمال کی لازمی جگہیں اور طویل مصوّتوں کے استعمال کی زیادہ سے زیادہ گنجایش تقریباً برابر ہیں۔ چناں چہ اس کا آہنگ بھی بڑا متوازن اور دلکش ہے اور غزل کے داخلی مزاج اور سوز و گداز کی ترجمانی کے لیے بیحد مناسب اور موزوں ہے۔

بحر کی موسیقی اور اس کے آہنگ کا انحصار بڑی حد تک ردیف و قوافی پر بھی ہوتا ہے۔ ردیف و قوافی بحر کی نغمگی اور اس کی غنائیت میں اضافہ کرتے ہیں اور اسے موسیقیت بخشتے ہیں۔ ردیف و قافیہ کی حیثیت غزل میں تقریباً وہی

ہوتی ہے، جو موسیقی میں تال کی ہوتی ہے۔ ردیف وقوافی کے ذریعہ بار بار دہرائی جانے والی اصوات غزل کے مجموعی صوتی تاثر کا تعیّن کرتی ہیں۔ ردیف وقوافی میں مسموع اصوات کی کثرت نغمہ کو خوش گوار بنا دیتی ہیں۔ ردیف وقوافی کی نغمگی کا انحصار سب سے زیادہ ان کی آخری صوت پر ہوتا ہے۔ طویل مصوّتوں پر ختم ہونے والی ردیفیں شعر میں زیادہ غنائیت اور نغمگی پیدا کر دیتی ہیں۔ غیر مردّف غزلوں میں قافیے کی آخری صوت کا اثر بالکل یہی ہوتا ہے۔

مصمّتوں پر ختم ہونے والے ردیف وقوافی ایک مختلف آہنگ رکھتے ہیں۔ عام طور پر /م/، /ن/، /ل/ یا /ر/ جیسے مسموع اور جھنک دار مصمّتوں پر ختم ہونے والے ردیف وقوافی خوش آہنگ ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف غیر مسموع اور دھیمے سُر رکھنے والے ردیف وقوافی غزل کی غنائیت کو کم کر دیتے ہیں۔ ہائیہ اور کوز مصمّتے ردیف وقوافی کے آخر میں لائے جائیں تو انھیں بدآہنگ بنا دیتے ہیں اور غزل کی غنائیت کو مجروح کرتے ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم ''بالِ جبریل'' کی غزلیات کو دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے بڑے دلچسپ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ''بالِ جبریل'' کی غزلیات کے ۴۵۴ اشعار میں سے ۳۱۷ (یعنی ۷۰ فیصد) اشعار طویل مصوّتوں پر ختم ہوتے ہیں۔ ان اشعار میں /م/، /ن/، /ل/ اور /ر/ پر ختم ہونے والے ۱۵۷ اشعار کو اور جوڑ لیا جائے تو یہ تعداد ۴۷۳ یعنی کُل اشعار کا ۸۲ فیصد ہو جاتی ہے۔ مزید برآں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ''بالِ جبریل'' کی غزلیات کے ایک شعر کا اختتام بھی کسی ہائیہ یا کوز مصمّتے پر نہیں ہوتا ہے۔

اس جائزے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبالؔ نے ''بالِ جبریل'' کی غزلوں کے لیے بیش تر مدھم لے والے سبک رو اوزان کا انتخاب کیا ہے، جو داخلیت اور سوز و گداز پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں اور جذبات کی تھمی ہوئی کیفیات کی ترجمانی کے لیے انتہائی مناسب اور موزوں ہیں۔ ان کی غزلوں کے بیش تر اشعار کا اختتام طویل مصوّتوں یا پھر /م/، /ن/، /ل/ اور /ر/ جیسے مسموع اور جھنک دار مصمّتوں پر ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ان میں بے پناہ غنائیت اور نغمگی پیدا ہو گئی

○○○

ڈاکٹر سرفراز جاوید

خضرِ راہ کا منشور

ڈاکٹر محمد اقبال کے کلام میں فکر و عمل کے جذبہ کے تحرک کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ انسان کے عزم وجوش میں اضافہ کرتا ہے۔ یوں بھی انسانی زندگی کا سفر حرکت و عمل سے تعبیر ہے۔ خالق کائنات نے زمانہ کی قسم کھا کر انسانی تقدیر کو اس کے فکر و عمل سے وابستہ کیا ہے۔ علامہ ابن آدم کی مقصدی زندگی کے پیامبر ہیں۔ وہ اس کی زندگی کے ہر لمحہ میں انقلاب کے خواہاں ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ دنیاوی زندگی میں اس کا فکر و عمل انتہائی اہم ہے۔ جس کی بنیاد پر دنیا و آخرت کی سرخروئی یا بدروئی عطا ہوگی۔

اقبال کی ''خضرِ راہ'' نظم چھ ذیلی عنوانات اور گیارہ بندوں میں ۵۸، اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۲۱۹ کی اہم اور انقلابی سوز سے پر تخلیق ہے۔ انھوں نے یہ نظم ۶۲۹۱ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی۔ جس کی تاثیر کا یہ عالم تھا۔ وہ خود اور سامعین کا مجمع اشکبار تھا۔

'خضرِ راہ' کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے۔ کہ علامہ نے نظم تحریر کرنے سے قبل اپنے مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ کی رو سے انسانی حیات اور اس کے فکر و عمل پر انتہائی غور کیا ہے۔ تب کہیں اس پر چند اہم سوالات قائم کیے۔ انھوں نے ان سوالوں کے جواب، اپنے فکر و مطالعہ کی رو سے خود ہی دیے ہیں۔ مگر جواب کی خاطر علامتی طور پر اس مقدس ہستی کا انتخاب کیا ہے۔ جو کہ؟ ارض پر مدت مدید سے زندگی گزار رہی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال کے نزدیک خضرؑ حیاتِ انسانی کے سفر کو سمجھنے والی خاص معتبر ہستی ٹھہرتے ہیں۔ اللہ نے ان کو طویل زندگی کے ساتھ مخصوص علم بھی عطا کیا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے راز سے کما حقہ واقف ہیں۔ شاعر خاکِ بشر کی زندگی کے راز جاننے کے لیے بڑا متجسس ہے۔ وہ خیالی طور پر خضرؑ سے ملاقات کرتا ہے۔ تو وہ پہلے بند میں ان سے براہ راست برسر مطلب بات کرنے سے قبل خود کو ذہنی طور پر تیار کرتا ہے۔ وہ خود ایک دریا کے ساحل پر جاتا ہے۔ وہ وہاں کی فطری فضا کو شعری پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وہ ساحل پر رات کے وقت اضطراری حالت میں چہل قدمی کر رہا ہوتا ہے۔ تو اس کو چاروں طرف سکوت طاری ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ شاعر کو ہوا اور دریا بھی پرسکون معلوم ہوتے ہیں۔ دریا تو اس

قدر پرسکون بہہ رہا ہوتا ہے۔ کہ بادی النظر میں ٹھہرے پانی کی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ موجوں کی بھی حرکت نظر نہیں آتی۔ پرندے رات کے سناٹوں میں آشیانوں کے اندر بسیرا کیے ہوتے ہیں۔ ستارے اپنی مدھم روشنی میں چاند کے طلسم میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ رات کی تاریک فضا میں یکا یک شاعر کی حضرت خضرؑ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ شاعر کو وہ جوانوں کی طرح بڑے چاق و چوبند نظر آتے ہیں۔ وہ شاعر کو دیکھ کر اس کے اضطراب کی وجہ بتاتے ہیں۔ کہ تو اس دنیاوی نظام کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کا مشتاق ہے۔ اگر تو دل کی آنکھ کھول کر غور و فکر سے کام لے، تو ضرور اس کائنات کے راز سے واقف ہو سکتا ہے۔ اقبال یہ موقع پا کر اپنے جذبہ؟ دل کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں۔:

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہیدِ جستجو تھا، جو سخن گستر ہوا

اقبال دوسرے بند میں خضرؑ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ کہ تیری جہاں بیں آنکھیں ان طوفانی اسرار و رموز سے بھی واقف ہیں۔ جو ابھی پردہ؟ خفا میں خاموش پڑے ہوئے ہیں۔ جو مستقبل میں وقوع پذیر ہوں گے۔ اقبال اس بات کا جواز، قرآن کریم کی سورہ کہف کی آیات کے مفہوم کو تلمیحی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ کہ آپ کے علم پر حضرت موسیٰؑ بھی حیرت زدہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ آپ کے غریب کی کشتی میں سوراخ، بے گناہ بچہ کا قتل اور بغیر کسی اجرت کے یتیم بچہ کے مکان کی دیوار کی تعمیر کرنے کی خود سے وجوہات نہ جان سکے۔ مزید ان کی توصیف میں عرض کرتے ہیں۔ کہ آپ صحرانوردی کو آبادی کی بود و باش پر ترجیح دیتے ہیں۔ آپ کی زندگی کرۂ ارض پر وقوع پذیر شب و روز کی گردش سے ماورا ہے۔ اقبال اس تمہید کے بعد اپنے مقصد پر آتے ہیں۔ یعنی وہ بنی نوع انسان کی دنیاوی حیات کے منشور کے تعلق سے چند اہم نکات پر سوالات قائم کرتے ہیں۔ آپ صحرانوردی کیوں کرتے ہو؟ انسان کے لیے زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟ سرمایہ اور محنت کے مابین تصادم کیوں ہو رہا ہے؟ دنیائے اسلام پر مصائب و آلام کی کیا وجہ ہے؟ ایشیائی نوجوان مغربی قوموں کی طرز زندگی کو کیوں ترجیح دے رہے ہیں؟ یہ کیا وجہ ہے، کہ بادشاہ تو دنیا سے رحلت کرتے رہتے ہیں تاہم بادشاہت ہنوز زندہ ہے؟ عرب قومیں اپنی توقیر و عزت غیروں کو بیچ رہی ہیں۔ مزید ان سے دوستی بھی روا رکھی ہوئی ہیں۔ ترک قوم و عوام پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا امتحان لینا چاہتا ہے؟ اقبال کا درد سوز دروں بن کر شعری پیکر میں ڈھل جاتا ہے:

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے!

اقبال کے پر درد سوالات سن کر خضرؑ جواب دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جوابِ خضرؑ میں وہ صحرانوردی کے

تعلق سے تیسرے بند میں بتاتے ہیں۔ کہ یہ جنگل کی بھاگ دوڑ حقیقی زندگی کی دلیل ہے۔ اس سے مراد حرکت وعمل ہے۔ وہ رہین خانہ سے مخاطب ہوتے ہیں کہ قافلہ بانگ رحیل سن کر رواں دواں ہوجاتا ہے اور منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر وہ بانگ رحیل پر حرکت وعمل سے بے نیاز ہوجائے، تو منزل نہیں پاسکتا۔ ہرن کی زندگی پر غور کریے، کہ وہ بھی ریگستان میں ٹیلوں پر بے سروساماں، بے پروا ہوکر اچھل کود کرتا ہے۔ خضرؑ بھی بے سروسامانی کی حالت میں جنگل میں بہت دور چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھیے کہ جب سورج کی نمود وآمد، صبح برپا کررہی ہوتی ہے۔ تو وہ اس وقت آسمان کے افق پر جبرئیلؑ کی پیشانی معلوم ہوتا ہے۔ ہاں مگر صحرائے شام کی خاموش فضا میں، آفتاب کے غروب ہونے کے منظر سے حضرت ابراہیمؑ کی فکر وبصیرت پر معرفت الٰہی واضح ہوئی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دنیاوی قافلے اور کارواں جب کسی پانی کے چشمے پر ہجوم لگاتے ہیں یعنی اہل ایمان سلسبیل کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ تو وہ وہاں پر تشنگی کو سیراب اور تھکن کو دور کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ متحرک شخص ہی نئی چیزوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ جو لوگ آبادیوں میں بیٹھ کر آرام طلبی کے عادی ہوتے ہیں وہ کسی کھیت کے کھجوروں کے پیڑوں کی قطار کے مانند ہوتے ہیں۔ جو کسی کاشتکار کی نگہبانی کے منتظر ہوتے ہیں۔ دراصل انسانی زندگی ذاتی محنت، جدوجہد اور جفاکشی سے مستحکم ہوتی ہے۔ ابن آدم جہد عمل کے اسی نکتہ ؟ راز پر مسلسل گامزن رہ کر ہی دوامِ زندگی اور جامِ زندگی کی تمثیل بن سکتا ہے:

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

شاعر چوتھے بند میں حضرت خضرؑ کے ذریعہ حقیقی زندگی کے حوالے سے یہ نقطہ پیش کرتا ہے۔ کہ اگر خاکِ بشر مقصد حیات پر سنجیدگی سے غور وفکر کرے تو وہ دنیاوی زندگی کے سود وزیاں سے بالاتر ہوسکتا ہے۔ انسان کو حکمِ خداوندی کے مطابق دیگر انسانوں کی دونوں جہاں کی فلاح وبہبود کی خاطر اپنی زندگی وقف کردینی چاہیے۔ حتیٰ کہ مادی حیات کے آج کل اور برس وماہ کے پیمانہ سے ماورا، فکر وعمل سے وابستہ رہنا چاہئے۔ کیونکہ حرکت وعمل کی برکت سے زندگی میں ہردم جوانی کے سرور کا احساس بنا رہتا ہے۔ یہی زندہ لوگوں کی حقیقت ہے۔ اسی طرح کے شخص مسلسل عملی کاوش کے ذریعہ خود اپنی دنیا پیدا کرنے کے مجاز ہوجاتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ ابن آدم کی رازِ زندگی اللہ کے خاص کلمہ ؟ کن فکاں کا مظہر ہے۔ انسان کو بھی عملی اعتبار سے خالقِ حقیقی کی اہم سنت 'کل ھو فی شان' کا پرتو ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسانی حیات کا راز محنت ومشقت میں مضمر ہے۔ فرہاد نے اپنی کوہ کنی کی بدولت انتہائی مشکل کام انجام دیا۔ تو زندہ جاوید ہوگیا۔ ہاں دنیاوی مشاہدہ کی رو سے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ کہ غلامی انسانی فکر وعمل کے دائرہ کو محدود بنادیتی ہے۔ مگر آزادی میں فکر وعمل اور ترقی کے ہزارہا مواقع بنے رہتے ہیں۔ خالق

نے آدم کے خاکی جسم میں بھی کائنات کو مسخر کرنے کی قوت ودیعت کی ہے۔مگر آدم کی ہستی مانند حباب ابھری ہے۔یعنی یہ ہستی بہت ہی ناپائیدار ہے۔وہ اس امتحان گاہ یا دارالعمل میں جتنی ایمان داری سے محنت کرے گا اس کی جزا پائے گا۔ہاں اگر خام مٹی کی مانند ڈھیر بن کر رہے گا،تو وہ قطعی بیکار ہے۔لیکن جفاکشی اور محنت کو شعار بنا کر مضبوط ومستحکم ہوجائے،تو پھر ایسی تلوار کی مانند ہوجائے گا۔جس کی کاٹ سے بچنا بہت مشکل ہے۔یعنی وہ دنیاوی معاملات میں انتہائی مجرب ہوگا۔ایسے شخص کی ہر بات اہمیت کی حامل ہوگی۔شعر پر توجہ دیجیے:

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہوجائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

پانچویں بند میں خضرؑ مزید فرماتے ہیں۔کہ جو انسان صداقت پر جان واری کرنے کی طلب وتڑپ رکھتا ہے۔تو وہ دین متین کی پیروی محمدؐ کے اسوہ پر قائم کرے۔پیکرِ خاکی میں حقیقی زندگی کا جوہر بروئے کار لائے۔حتیٰ کہ وہ زمین وآسمان کی مستعار چیزوں سے گریز برتتے ہوئے،اس کو خاکی جسم کے برتے پر خود اپنا جہاں تعمیر کرنا چاہیے۔نوع آدم تمام قوتوں کو بروئے کار لاکر اپنی استعداد کی چنگاری کو دوام عطا کرے۔تو وہ اپنے علم وعمل کی محنت سے مشرقی خاک پر آفتاب کی مانند درخشاں ہوکر اقوام عالم کی نظر میں اپنے اسلاف جیسی عظمت وجلال کا نمائندہ بن جائے گا۔انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خالقِ ربی کی رضا کے لیے سحر خیزی اور نالہ؟ شب گیری کا اہتمام کرے۔جس سے طبیعت میں خشوع وخضوع کی کیفیت در آتی ہے۔مزید دعا میں تائید یزدی بھی حاصل ہوتی ہے۔وہ اس طرح شب انجم میں اپنے رازداں پیدا کرنے کا مجاز ہوجاتا ہے۔علامہ نوع بشر کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں روز محشر کے تصور کو سامنے رکھ کر دنیاوی اعمال کو بروئے کار لانا چاہیے:

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصہ ؟ محشر میں ہے
پیش کر غافل، عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

اقبال چھٹے بند میں خضرؑ کے ذریعہ تیسرے سوال کے جواب میں سلطنت کے زعم باطل پر اظہار کرتے ہیں۔اس بند کے پہلے شعر میں قرآن کی معروف سورہ النمل کی آیت ۳۴ کے مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔دنیا کی بیشتر قوموں کی سلطنت کا یہ رویہ رہا ہے کہ جب کوئی سلطنت کسی قوم پر فتح پاتی ہے،یعنی غالب آتی ہے تو وہ ان قوموں کے معزز لوگوں کو ذلیل وخوار کرتے ہیں۔مزید وہاں کی بہت سی چیزوں کو تباہ وبرباد کردیتے ہیں۔بعدازاں وہ مغلوب قوم کی عملی کارکردگی پر گہری نظر بھی رکھتے ہیں۔اگر اس قوم کے افراد غلامی سے آزادی پانے کے لیے بیدار ہوتے ہیں۔تو وہ طاغوتی فلسفہ یعنی سام، دام، دنڈ اور بھید کے ذریعہ ان کو خاموش کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔عصری

جمہوری نظام میں بہت سی برسراقتدار جماعت بھی کچھ اسی طرح کا رویہ روا رکھتی ہیں۔عموماً حکمران یہ کوشش کرتے ہیں۔کہ وہ قومی دانشوران کو بہت سے خطابات اورانعامات سے نواز کر فکرِ ایازی کا اسیر بنادیں۔مگر خالقِ کائنات ایسی حالت میں طاغوتی قوتوں پر ضرب لگاتا ہے۔وہ اپنی مشیت سے قوم کو آزاد کرانے کے لیے کسی موسیٰ کی بعثت بروئے کار لاتا ہے۔حقیقت یہی ہے کہ کائنات میں صرف سروری اللہ رب العزت کی ہی باقی رہے گی۔خالقِ کائنات کے اس زمینی اسٹیج پر ہرنوع کے انسانی نمائندہ صرف اپنا رول ادا کر کے رخصت ہوجاتے ہیں۔یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آزری

درحقیقت اسلام میں انسانی تدین کی رو سے فکروعمل کی آزادی یہ ہے۔وہ اللہ کے سوا خود کو کسی کا غلام نہ تسلیم کرے۔اقبال کی دینی فکر یہ ہے کہ اگر انسان کائنات کی کسی شئے اور اپنے جیسے انسان کے سامنے سرخم کرتا ہے۔تو وہ برہمن کی کافری سے بھی بڑھ کر ہے۔علامہ خضرؑ کے واسطے ملوکیت کے منفی پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہیں۔وہ مغربی جمہوریت کو بھی باطل طرزِ فکر کی بدلی ہوئی صورت مانتے ہیں۔دنیا کے تاریخی صفحات میں جمہوری نظام پر غور کرنے سے یہ باور ہوتا ہے۔کہ اس عہد کے اعلیٰ حکمرانوں نے بھی اپنے مخالفین پر خصوصی ظلم وزیادتی روا رکھی ہیں۔مزید عوام بھی ان کی سیاسی غلطیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ تاہم اس کو دیگر طرزِ حکومت میں خوب تر سمجھتے ہیں،شاید اس میں انسان کے ذہنی غبار کے اخراج کی کافی گنجائش ہے۔ورنہ جمہوری نظام کے آقاؤں کے ذریعہ وضع کیے گئے قوانینِ اصلاحات سب افیون کی گولیاں ہیں۔جن پر شیریں ملمع چڑھا دیے گئے ہیں۔یہ گولیاں کھانے میں بڑی لذیذ اور میٹھی معلوم ہوتی ہیں۔ان کے کھانے والے سرور میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔اور ایسے غافل ہوتے ہیں۔ان کو حقیقی آزادی کی فکر بھی پیدا نہیں ہوتی۔بس وہ جمہوری نمائندوں کی تقریر سن کر ہی حکومت کو مہربان سمجھ لیتے ہیں۔عموماً یہ سب باتیں سرمایہ داری کے فریبی ہتھکنڈہ ثابت ہوتے ہیں۔جن کے ذریعہ عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔عام لوگ جمہوری فریب وسراب کو گلستاں سمجھ لیتے ہیں۔وہ اس خیالی گلستان میں اپنے آشیانے تعمیر کرتے رہتے ہیں۔درحقیقت یہ سب ہمارے لیے قفس کی مانند ہیں۔اقبال افسوس ظاہر کرتے ہیں:

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اقبال نے ساتویں بند میں سرمایہ اور محنت پر قارئین کی توجہ مبذول کی ہے۔وہ حضرت خضرؑ کی زبان سے

سرمایہ دارانہ طرز فکر کی خوب مذمت کرتے ہیں۔ بعدازاں وہ مزدوروں سے مخاطب ہوتے ہیں کہ یہ پیام میرا نہیں بلکہ خالقِ کائنات کا پیغام ہے۔ جو بندۂ مزدور کے لیے بڑی خوش بختی کا حامل ہے۔ خالقِ حقیقی نے محبوبؐ کی زبان سے مزدوروں کی کیا خوب دلجوئی کرائی ہے۔ فرمان ہے 'الکاسب حبیب اللہ' کہ محنت مزدوری کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔ مگر یہ نظام مزدوروں کے استحصال میں یقین رکھتا ہے۔ کیونکہ مزدور طبقہ اس کی دولت کے فروغ میں معاونت کرتا ہے۔ تاہم وہ طبقہ ان کو مزدوری بھی کچھ اس طرح سے دیتا ہے جیسے عموماً دولت مند لوگ غریبوں کو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اقبال نے ساحر الموط کی تلمیح و ترکیب کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے، یعنی سرمایہ دار کی دی ہوئی مزدوری کو ہی وہ آب حیات سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ سرمایہ دار کے اس طرز عمل کو اپنی زندگی کی بقا مانتا ہے۔ جب کہ حقیقت قطعی برعکس ہے۔ اگر مزدور اس کے یہاں محنت سے کنارہ کش ہو جائے تو سرمایہ دار کا خاتمہ یقینی ہے۔ لیکن اس نظام نے اولادِ آدم کے مابین تفریق کے اتنے شوشے پیدا کر دیے ہیں۔ کہ ہم سب منفی فکر کی بدولت متعصّبانہ طرز عمل کے حامل ہو گئے ہیں۔ کہ اب حقیقی انسان کی فکر کو بروئے کار لانا انتہائی مشکل امر معلوم ہوتا ہے۔ یہ تعصّبات وطنیت، نسل و رنگ اور تہذیب و تمدن کے نام پر ایجاد کر دیے گئے ہیں۔ آج اولاد آدم تعصب پرستی میں مبتلا ہو کر مقصد حیات سے غافل ہو گئی ہے۔ وہ خیالی دیوتاؤں کی خاطر باہم متصادم ہے۔ اسی تعصبی نشہ کے سرور میں اپنی حیات و زیست کو تباہ و برباد بھی کر رہی ہے۔ مزدور اپنی سادگی اور سادہ لوحی کی وجہ سے سرمایہ داروں کی مکاری اور عیاری کے جال کے پھندوں سے نہیں نکل پاتا۔ تاہم شاعر اپنے رجائی تفکر کی رو سے روسی انقلاب کو پیش نگاہ رکھتا ہے۔ وہ اسی سیاق میں خضرؑ کی زبان سے مزدوروں کا خوب حوصلہ بڑھاتا ہے:

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

آٹھویں بند میں وہ مزید رجائی فکر کو بروئے کار لاتے ہیں۔ علامہ خضرؑ کی زبان سے مزدوروں کے عزم و جوش میں توانائی کی روح پھونکتے ہیں۔ اگر تو ہمت و حوصلہ سے کام لے کر دنیا کی حکومت اپنے ہاتھوں میں لے سکتا ہے۔ جس سے دنیا تیرے قدموں پر نثار ہو جائے گی۔ آخر کب تک آجر کا اجیر بن کر روزانہ کی اجرت پر کام کرتا رہے گا۔ یوں بھی اب دنیا میں آزادی کی فکر حاوی اور جمہوریت کا دور ہے۔ تو کب تک ملوکیت اور سرمایہ داری کا غلام بن کر زندگی گزارے گا۔ اب تو تازہ آفتاب بھی طلوع ہو چکا ہے۔ یعنی روس کا انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ اس لیے اب قدیم اور فرسودہ نظام کی اسیری کے گیت گانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یوں بھی سرمایہ داروں نے بتدریج دانستہ اور غیر دانستہ فطرت آدم سے روگردانی کی ہے۔ بلکہ انسانیت کی تمام حدود توڑ ڈالی ہیں۔ اے مزدوروں کب تک عیش و آرام کو

روتے رہوگے۔اب تو سرمایہ داروں کی غلامی سے باز آجاؤ۔غور کروتم اپنے زخموں کا علاج ان کے ذریعہ کیسے کر پاؤ گے۔کیونکہ تمھیں زخم دینے والے یہی حضرات ہیں۔تمہارے علاج کی تدبیر صرف سرمایہ داری کا خاتمہ ہے۔تم اس نظام سے چھٹکارا پا کر اپنی آزادی؟ فطرت میں داخل ہو جاؤ:

کرمکِ ناداں! طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

نویں بند میں اقبال دنیائے اسلام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔وہ خضرؑ سے اپنے قارئین کو اسلامی ممالک کی حالت زار سے آگاہ کراتے ہیں۔کہ مسلم حکمرانوں کی نادانیوں اور باہمی کشمکش کے باعث تمام اسلامی ممالک نصرانیوں کے غلام بن گئے۔ایرانی بھی اپنی تہذیب اور وقار سے بے نیاز،مغربی تہذیب کی خوشہ چینی کے لیے مجبور محض ہوگئے ہیں۔حتیٰ کہ عربی ممالک بھی وطنیت کے غیر اسلامی نظریہ کو قبول کر رہے ہیں۔جس کے اثرات سے اسلامی وجود پر خطرہ بڑھ جائے گا۔یقیناً وہ مغربی فلسفہ اور طرز فکر کو اپنا کر ٹکڑے،ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے۔اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے خون کی ارزانی پانی کی طرح بڑھ جائے گی۔یہ سب ان کے دانائے راز نہ ہونے کی وجہ ہے۔مگر اقبال یہاں بھی مسلمانوں کو مولانا رومی کی حکایت کے توسط سے حوصلہ بخشتے ہیں:

گفت رومیؔ ''ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند''
می ندانی ''اول آں بنیاد را ویراں کنند''

علامہ دسویں بند میں امید دلاتے ہیں۔اگر یہ ملک و دولت ہاتھ سے نکل گئی ہے۔تو مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔خالقِ کائنات یہ سب کچھ دوبارہ بھی عطا کرسکتا ہے۔بس تجھے فہم وفراست سے ان کے جانے کی وجوہات پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔اصل بات یہ ہے کہ تو اپنے علاج کی خاطر دوسروں کے پاس مت جا۔یہاں قرآن سے ماخوذ تمثیل پر غور کیجیے،بے شک تو کمزور چیونٹی ہے۔حضرت سلیمان کے پاس امداد طلب کے لیے نہ جا۔اے مسلمانوں تمھیں خود اپنا اتحاد قائم کرنا چاہئے۔اسی میں مشرق والوں کی نجات ہے۔وہ مسلمانوں کو مزید مشورہ دیتے ہوئے حقیقی نقطہ ؟ نظر پر توجہ دلاتے ہیں۔تم لوگ باہمی اور عارضی منفی سیاست چھوڑ کر صرف اسلام کی تبلیغ کے لیے یکجا ہو جاؤ۔یہ ملک و دولت دین کی اشاعت کے بالمقابل انتہائی ادنیٰ ثمر ہیں۔سب مسلم ممالک کو اسلام کی تبلیغ وتوسیع کی خاطر ملت واحدہ بن کر کام کرنا چاہیے۔اگر کوئی مسلم ملک رنگ ونسل کے امتیاز کو قبول کرے گا،تو وہ فنا ہو جائے گا۔ہاں اگر مسلمانوں نے رنگ ونسل کے تعصب سے بے نیاز ہو کر صرف دین و مذہب کو مقدم کرلیا تو تمام مصیبتیں خاک رہ گزر ثابت ہوں گی۔اے مسلمانوں اگر تم خلافت کی بنیاد دوبارہ قائم کرنے کے آرزومند ہو،تو تم میں

خلفا؟ راشدین جیسے صفات کے حامل شخص کی ضرورت ہے۔علامہ نے اس بند کے ٹیپ کے شعر میں مسلمانوں کے اسی ناسور پر نشتر چلانے کی کوشش کی ہے۔جس کے باعث امت مسلمہ بہت سے مصائب وآلام کے نزول کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔اقبال کہتے ہیں اے نادانوں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ میں کون افضل ہے۔اس میں ایسی جلی اور خفی چیزیں ہیں جن کا امتیاز نہیں کر سکتے۔

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

اقبال آخری بند میں خضرؑ کی زبان سے مسلمانوں کے لیے مژدہ پیش کرتے ہیں۔کہ اب مسلمانوں نے اپنے حال زار کے باعث اللہ کے حضور میں اپنی فریاد اور مناجات پیش کی ہے۔عنقریب اس کی تاثیر مرتب ہوگی۔تو نے مغربی قوموں کی مادہ پرستی کا باطل اور طاغوتی عروج دیکھ لیا ہے۔اب یہی مادہ پرستی ان کے لیے وبالِ جان بن جائے گی۔یہاں یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ اللہ کی یہ سنت ہے۔کہ وہ باطل کی تدبیر،اپنی مشیت کی رو سے خود ان پر پلٹ دیتا ہے۔علامہ ذریاتِ آدم کی طرز معاشرت کے لیے یہ بھی بتاتے ہیں۔کہ اسلام میں سہ گانہ اصول حریت،اخوت اور مساوات موجود ہے۔مسلمانوں کی سماجی زندگی میں انھیں اصولوں کا حامل معاشرہ قائم ہونا چاہئے۔یہی امت کی معاشرتی زندگی کی حقیقی تعبیر ہوسکتی ہے۔اسلامی اصولوں کے سیاق میں ملوکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ یقینی ہے۔بعدازاں دنیا میں اسلامی نظام کا احیا ہوجائے گا۔اقبال کے کلام میں مستقبل کے نظام کی دھندلی سی تصویر بھی دکھائی دیتی ہے۔یعنی جلد باطل کی رسوائی ہوگی۔کیونکہ اسلام اپنے آغازی دور میں بنی نوع انسان کے لیے باعث رحمت بنا اور اب بھی باعث رحمت ثابت ہوگا۔خالقِ آدم نے اپنے کلام میں بندوں کے فکر وعمل کی صحیح کارکردگی پر ان کی کامیابی وکامرانی کا وعدہ کیا ہے۔رب العلمین اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔اقبال نے اپنے کلام میں خضرؑ کی زبان سے مسلمانوں کو یہی نکتہ باور کرانے کی کوشش کی ہے۔اے مسلمانوں تم اللہ کے وعدہ کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے اپنے سینوں کو آرزوؤں سے آباد رکھو:

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر 'لایخلف المیعاد' دار

اقبال نے اس نظم کے ذریعہ مسلمانوں کو خصوصی طور پر یہ پیغام دیا ہے۔کہ انسان حیات مادی میں فکر وعمل کے تحرکِ پیہم کی بدولت سرخروئی حاصل کرسکتا ہے۔بلکہ اسی کی حرکت وبرکت سے آبرومندانہ زندگی بسر کرتا ہے۔وہ ایسے فرد ومعاشرہ کا خواہشمند ہے،جس کے افراد پرواز عمل میں کبھی تھک کر نہ گریں۔وہ ہر عمل میں ریاکارانہ ومنافقانہ

طرز فکر سے بے نیاز ہوں۔ وہ ہر طرح کی میڈیائی شہ سرخیوں سے بھی ماو؟ را ہوں۔ وہ صرف انقلابی فکر کی روسے زندگی کے تمام معاملات کو خوب سے خوب تر بنانے کی خاطر کوشاں ہوں۔ وہ سرمایہ داری کے باطل عفریت کو ختم کرنے کے لیے ہمہ دم مصروف رہیں۔ ہم سب پر، خاص طور سے ماہرین اقبال اور دانشورانِ ملت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کہ وہ اقبال کے فکری مقاصد سے قوم کے نونہالوں آ گاہ کریں۔

○○○

ڈاکٹر محمد شاہد خان

خضر راہ

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

آج میں نے اقبال کے پہلے مجموعہ کلام ''بانگ درا'' کی ایک معروف نظم کے ایک شعر کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ اقبال نے یہ نظم ۱۹۲۲ء میں عارضۂ نقرس کے شدید درد کے دوران لکھی اور عنوان ''خضر راہ'' رکھا۔ مشکل یہ تھی کہ خضر کا مکالمہ خضر ہی کی زبان معلوم ہو۔ سادہ الفاظ میں معنی کا ایک ایسا دریا موجیں مارے کہ سننے والے کو خضر کی بصیرت کا جلال محسوس ہو جائے۔ کیونکہ خضر کا کردار یقین و امید کی علامت ہے۔ خضر کے علاوہ کون ہمیشہ سے زندہ ہے اور کون ہمیشہ بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتا رہے گا؟ جو شخص ہزاروں سال سے زندہ ہو اور تا قیامت زندہ رہے گا، اس کی گفتگو کا انداز کیا ہوگا؟ جس نے ہزاروں سال میں ہزاروں قوموں کو بنتے بگڑتے دیکھا ہو۔ اس سے بڑھ کر زندگی کے راز سے کون واقف ہو سکتا ہے؟ گویا رازِ ازل وہی بتا سکتا ہے جو اس سے واقف ہو۔ اقبال چاہتے تھے کہ خضر کے مکالمے میں ایک تجربہ کار انسان کی جھلک دکھائی دے۔ اس لیے وہ رنج و غم اور یاس و ناامیدی کی اس دنیا میں ''خضرِ راہ'' بن کر آتے ہیں۔ گویا اقبال حضرتِ خضر کی شخصیت سے کس قدر واقف تھے۔ اس سلسلے میں ۲۹ مئی ۱۹۲۲ء کو سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوشِ بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جنابِ خضر کے اندازِ طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا۔''

یہاں اقبال کے دیدہ دل عالم تحیر کی پہنائیوں میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے جب قوموں کی حیات پر نگاہ ڈالی تو مسلمانوں کا لہو آبِ ارزاں نظر آیا۔ کیونکہ قوموں کی حیات اب تخیل پہ موقوف نہ تھی بلکہ ان کا تخیل عشق و مستی کا جنازہ بن گئی تھی۔ گویا قوموں کا تخیل جب مردہ ہو جاتا ہے تو قومیں کس قسم کا ادب اور فن تخلیق کرتی ہیں۔

آج کے عہد اور ادب کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ایسے خیال پیش کیے جا رہے ہیں، جن سے

قوتِ عمل افسردہ ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی
کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

یوں تو انسان کے لیے سب سے اہم مسئلہ زندگی کا ہے۔ اُسے اپنی زندگی عزیز ہے۔ اس لیے کہ فطرت نے اسے زندگی کی قوتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے پیدا کیا ہے۔ سب سے پہلی چیز جو انسان کو انسان کہے جانے کے قابل بنا سکتی ہے وہ زندگی کا صحیح تصور ہے۔ لیکن کیا اس طرح کی افسردہ اور غم پسند ذہنیت سے مشکلاتِ زندگی پر قابو پایا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ دراصل قوتِ فکر و عمل کے ساتھ تخیل کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ چونکہ تخیل کا فقدان قوموں کے زوال و انحطاط کا پیش خیمہ ہے۔ قوم کے اس تخیلی بحران کو اقبال نے بیسویں صدی میں ہی محسوس کر لیا تھا۔ یعنی آئندہ کی تقدیر ان پر بے حجاب ہو گئی تھی۔ لہٰذا انھوں نے ان نکات کو عوام پر ظاہر کرنے کے لیے نظم کا پیرایۂ بیان اختیار کیا کہ حضرتِ خضر نے اقبال کو اپنے راز بتا دیے ہیں۔ نظم کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

یعنی چاندنی رات تھی۔ دریا سو رہا تھا۔ خضر نمودار ہوئے۔ اقبال سے کہا کہ دل کی آنکھ سے دیکھنے پر دنیا کی تقدیر صاف نظر آتی ہے۔ یہ سن کر اقبال کے دل میں وہ قیامت برپا ہو گئی، جن سے قوم کے مردے زندہ کیے جاتے ہیں۔ نتیجتاً اقبال نے خضر سے پانچ چیزوں کے بارے میں سوال کیا: صحرا نوردی، زندگی، سلطنت، سرمایہ و محنت اور دنیائے اسلام۔ خضر نے ان سوالات کے جواب دیے۔ لیکن یہاں صرف صحرا نوردی اور زندگی سے متعلق جوابات کو پیش کر رہا ہوں۔

خضر جواب دیتے ہیں کہ ہمیشہ کی زندگی کا راز یہی ہے کہ حرکت کبھی نہ تھمے۔ جب رُک گئے وہی موت ہے۔ اس لیے میں صحراؤں میں رہتا ہوں۔ جبکہ زندگی کو قومی مقاصد کے سوا کسی اور پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔

میں ان جوابات کو موجودہ زمانے سے منسلک مانتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ مشرق مردہ ہو چکا ہے۔ اسے روزِ حساب سمجھنا چاہیے۔ لہٰذا جو آج نامۂ اعمال پیش نہ کر سکا اُسے پھر موقع نہیں ملے گا۔ کیونکہ ہماری بے خبری ہی ہمارے عمل کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اقبال نے کہا تھا ؎

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

اقبال زندگی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ان کے خیالات میں تنوع اور شاعری میں جوش و جذبہ ہے۔ اقبال کا تصورِ زندگی اور ان کی شاعری حیات سے لبریز ہے۔اقبال سے قبل ہمارے شعر و ادب میں انسانی زندگی کا تصور نہایت محدود اور پژمردہ تھا۔میرؔ و غالبؔ نے زندگی کو حباب مانا ہے۔جو لمحہ بھر کے لئے نمودار ہوتا ہے اور پھر بحرِ غم میں ڈوب جاتا ہے۔گویا زندگی شبنم تھی جو پرتو نور کے ساتھ اڑ گئی۔جبکہ اقبال زندگی کے تغیر کو بہت شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان کے مطابق جو زندگی کی تلاش کرتا رہتا ہے وہی دنیا میں کامیاب و کامران ہوتا ہے۔لیکن جو لوگ آبادیوں میں بے مقصد زندگی بسر کرتے ہیں اور راحت کے طالب ہو جاتے ہیں تو ان کی یہ راحت پسندی ان کے حق میں پیامِ موت بن جاتی ہے۔یعنی انسان اسی وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کے دل میں تڑپ رہتی ہے اس لیے کہ تڑپ کا جذبہ ہی اسے عملِ پیہم کے لئے مجبور کرتا ہے۔یعنی زندگی کی گرہ جوشِ عمل سے کھلتی ہے اور یہی ہمیشہ کی زندگی کا راز بھی ہے۔

○○○

ابوذر انصاری جون پوری

انتساب میں شعرِ اقبال کی معنی آفرینی

اقبال ہمارے شب وروز کی زندگی کا ناگزیر حصہ بن گئے ہیں۔ کثرتِ استعمال سے ان کے اشعار محاورہ کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ بیشتر موضوعات اور مناسبات میں ان کے اشعار کی حکیمانہ معنی آفرینی ایک اعجوبہ ہے۔ ایک عمومی مشاہدے کے مطابق انتساب میں ان کے اشعار کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔اس مضمون میں چند کتابوں میں موجود اشعار پر گفتگو کی گئی ہے۔راقم نے چند برس قبل انتساب پر ایک مضمون سپردِ قلم کیا تھا اہل علم نے اس کی پذیرائی کی اور پسند فرمایا تھا۔ پسندیدگی کے پیشِ نظر سلسلۂ تحریر کا یہ دوسرا حصہ ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ معروف اقبال شناس پروفیسر عبدالحق کی کم وبیش پچپن تالیفات ہیں۔ چار پانچ کتابوں کے علاوہ سبھی پر انتسابی تحریر موجود ہے۔ ہر انتساب اقبال کے شعر یا مصرع سے مزین ہے۔اقبال کے اشعار کی بوقلمونی اور وادیٔ خیال کی بے کراتی حیرت انگیز ہے۔پیشِ نگاہ پروفیسر عبدالحق کی چند کتابوں کے انتساب پر گفتگو کی جارہی ہے۔وسعتِ بیان کے لیے تلاطم ہائے دریا کی دریابی درکار ہے۔ چند پر اکتفا کرنا میری مجبوری ہے۔

ایک کتاب ہے **سوز وگدازِ زندگی** جو مشفق ومہربان خطیب شہر مولانا محمد عمر جعفری مرحوم رئیس مچھلی شہر کے نام منسوب ہے۔مولانا محمد عمر جعفری مرحوم رئیس مچھلی شہر تو تھے ہی علم وفضل میں بھی ان کی مستحکم پہچان تھی۔ خاندانی آدمی تھے۔کافی بڑی لائبریری تھی۔قدیم نسخے ،مخطوطے اور کمیاب ونادر کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔اپنی حیات ہی میں کتب خانے کو جامعہ ہمدرد (ہمدرد یونیورسٹی) کے لیے وقف کر دیا تھا۔کتابیں ٹرکوں پر لاد کر دہلی لے جائی گئیں اپنی لائبریری اور کتابوں سے انھیں عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے بھی اس لائبریری سے اپنے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ڈاکٹر صاحب اور مولانا جعفری مرحوم میں تکریم ومودت کا ایک باہمی ربط تھا اور انتساب اس یگانگتِ چندروزہ کو زمانے کی دست وبرد سے محفوظ اور یادگار بناتا ہے۔

'مشفق ومہربان' جامع لفظ ہے۔ یہ عموماً اپنے کسی بزرگ اسی درجے پر فائز کسی محترم شخص کے لیے استعمال

ہوتا ہے اور یہاں یہ محض ایک لفظ نہیں بلکہ مولانا جعفری مرحوم سے ملنے والی بزرگانہ شفقت ومحبت کا حرفِ راز بھی ہے اور اس کا انکشاف واعتراف بھی۔

'خطیب شہر' اور 'رئیس مچھلی شہر' کی تکرار لفظی سے جو خوشنما آہنگ پیدا ہوتا ہے وہ آہنگ بھی اپنے قاری کو شعری لطافت اور اس کی لذتوں سے آشنا کرتا ہے ان کے یہاں ایسی ہی ایک اور مثال اس وقت بھی دیکھنے کو ملتی ہے جب وہ مچھلی شہر کی علمی تاریخ پر ایک شاندار مضمون قلم کے حوالے کرتے ہیں اور اس کو ''مچھلی شہر کی علمی شہر یاری'' عنوان دیتے ہیں، تو اس جگہ بھی وہ گویا شاعری ہی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں 'مچھلی شہر' اور 'علمی شہر یاری' کی ترکیب سے دونوں میں جو باطنی ربط نکلتا ہے ''ایک مضراب کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو سرخوشی کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ نثر میں شاعری کا لطف پیدا کرنا ڈاکٹر صاحب کا کمال تحریر ہے جو جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے جو انتساب لکھے ہیں صرف انھیں کو دیکھا جائے تو بھی ایسا لگتا ہے جیسے علامہ اقبال کے نظریات زندگی اور فلسفۂ خودی پر مشتمل افکار واشعار ڈاکٹر صاحب کے رگ وریشے میں رچ بس گئے ہیں یا یوں کہا جائے کہ وہ علامہ اقبال کے فکر وفلسفہ کی تہوں میں اتر گئے تو غلط نہ ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں اپنی جتنی بھی کتاب پر انھوں نے انتساب لکھے ہیں اور چاہے جس طرح کا بھی ان میں جذبہ یا احساس پیش کیا ہو، سب کو عروج کمال تک پہچانے میں علامہ کے کسی نہ کسی مصرعے نے ان کی دستگیری کی ہے یہاں بھی جب دل کو مولانا جعفری مرحوم کی شفقتیں یاد آئیں اور انھیں کوئی تحفہ دینے کے لیے جی بے چین ہوا، تو اقبال ہی کا مصرع دل کا ترجمان بن کر سامنے آیا۔ ع

''مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا''

ایک دوسری تصنیف میں انتساب کی صورت ملاحظہ ہو:

رشید احمد صدیقی کا ثقافتی پس منظر نظارہ بذات خود کوئی شے نہیں ہے بلکہ چند روشن چیزوں کے کسی مقام پر اجتماع سے جو خوبصورت منظر بنتا ہے، جو دلکش سما پیدا ہوتا ہے حسن ودلکشی کا وہی عالم نظارہ کہلاتا ہے۔ نظارے کا تعلق نظر یعنی دیکھنے اور محسوس کرنے سے ہے۔ لغات میں اس کا ایک معنی ملاقات بھی آیا ہے۔

علامہ اقبال کے یہاں بڑی متنوع مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے ہر لفظ میں جہان معنی پوشیدہ ہوتا ہے یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں مذکورہ ہر دو مفہوم کی وسعت کو ایک ہی لفظ 'نظارہ' اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے وہ لفظوں کو جس نظام ترتیب کے تحت شعر میں لاتے ہیں اس سے اہل بصیرت کو مفہوم ومعنی کی اچھی گنجائش مل جاتی ہے۔ علامہ اقبال کے اس مصرعے میں پروفیسر عبدالحق نے جس طرح کی نکتہ آفرینی کی ہے وہ بھی قابلِ نظارہ ہے ان کے باہنر قلم نے ایک ہی مصرعے کو معنی کی متعدد جہتیں تفویض کر دی ہیں جو بہر حال قابل تحسین ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے

کہ ڈاکٹر شباب الدین صاحب کی ذات اور علامہ اقبال کے اس مصرعے کے درمیان کیا کوئی علاقہ ہے؟ یا کسی ربط وتعلق کے بغیر ہی اسے چسپاں کر دیا گیا ہے بظاہر تو کسی ارتباط کی صورت نظر نہیں آتی۔تو پھر سوال ہے۔کیا ایک ماہر اقبالیات نے علامہ اقبال کے مصرعے کو بے موقع و بے محل استعمال کیا ہے۔کیا ربط وتعلق سے بے نیاز ہو کر علامہ کے مصرعے کو کہیں بھی چسپاں کر دینا مناسب ہے؟ ہرگز نہیں۔لیکن میں تو کسی سوال میں پڑنے کی جگہ درطۂ حیرت میں پڑ گیا ہوں،ان کی درا کی اور ذہانت دیکھ کر آفریں کہتا ہوں ان کی چشم بصیرت کو۔انھوں نے کس ہوشیاری سے ڈاکٹر شباب الدین صاحب کے نام میں ایک ایسی کڑی کو دریافت کر لیا ہے جو اس مصرعے میں آئے ہوئے ایک لفظ کے ساتھ بہ آسانی لگا کھا سکتی ہے۔اور بس اسی سبب سے یہ مصرع برمحل اور بامعنی ہے۔لیکن یہ کس طرح ہے آیئے دیکھتے ہیں۔

''سراپا نورم از نظارۂ تو''

یہاں مصرعے کے دوسرے جزو''از نظارہ تو''لفظ'تو'ضمیر ہے اور مخاطب ومرجع اس کا ڈاکٹر شباب الدین ہیں ڈاکٹر صاحب کے نام کا پہلا جزو'شباب' ہے۔جن کا نظارہ باعثِ نور وسرور ٹھہرا اور اس کا نظارہ بھی کیا جا سکتا ہے۔اس طرح دونوں میں ربط کی صورت نکل آئی اور بے محل مصرع برمحل ہو گیا۔اسی'شباب' کی رعنائی،دل ربائی اور اس کی جلوہ طرازی سے تشکیل پانے والا خوشنما منظر جسے آنکھوں نے دیکھا،اس سے وہ کہتے ہیں،میں سراپا نور ہو گیا ہوں، جذباتی ہوا ٹھا ہوں۔دیکھا آپ نے پروفیسر عبدالحق کے ذوق وذہانت نے کس ترکیب افتراق سے اپنے لیے موقع ومحل پیدا کر لیا۔

علامہ اقبال کا شعری ذخیرہ بہ لحاظِ تعداد ایک سمندر ہے اور اس کے ہر شعر میں علم وآگہی کا ایک دریا رواں ہے۔اس سمندر سے گوہر مقصود یعنی ایسے شعر یا مصرعے کو تلاش کرنا جو موضوع ومافی الضمیر کی حسنِ ادائیگی میں مددگار ہو آسان نہیں ہے لیکن پروفیسر عبدالحق کے اندر علامہ اقبال کے فکر وفلسفہ سے جو والہانہ رغبت ہے اس کی سعی رسا نے اس مشکل کو ان کے لیے آسان کر دیا ہے اور وہ تہہ آب موتیوں کی ایک لڑی تلاش کرنے میں کامیاب ہیں۔جس کے لفظ'نظارہ' اور ڈاکٹر صاحب کے نام کے جزو'شباب' کے ساتھ وہ ایک ممکنہ معنوی نسبت پیدا کر لیتے ہیں۔اس طرح کے بیدار نکتہ رسی اور شعور کے نمونے پروفیسر عبدالحق کے تقریباً ہر انتساب میں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

اس کا ایک اور رُخ اس وقت سامنے آتا ہے جب انتساب کے اولین سہ لفظی فقرے پر جس میں ایک حرف عطف بھی داخل ہے غور کیا جائے،اور'نظارہ' کے معنی منظر اور دیکھنا نہ لیا جائے بلکہ اس کے بجائے ملنا اور ملاقات کرنا لیا جائے۔کیونکہ ملاقات سے مشاہدہ اور نظارہ بطور اولیٰ حاصل ہوتا ہے۔اور اس کا مطلب لیا جائے کہ جب ملاقات

ہوئی تو اخلاقی کیفیات مشاہد ہوئیں۔ اور عملی زندگی میں ان کے حسن کارکردگی کا بھی تجربہ ہوا جس سے ڈاکٹر صاحب کے شبابِ کار میں چار چاند لگتا ہے پروفیسر عبدالحق کے دماغ ودل نے ان کے اخلاق وعمل کے پرنور امتزاج سے، تعمیر ان کی زندگی کے صبح وشام سے جن اثرات کو قبول کیا ان کے اظہار کے لیے علامہ اقبال کا یہ مصرع موزوں ترین ٹھہرا۔

''سراپا نورم از نظارۂ تو''

لیکن یہاں تک پہنچنے کے لیے تھوڑی سی زحمت اٹھانی ہوگی۔ پروفیسر عبدالحق کے ذہن کی گہرائیوں میں اترنا ہوگا جہاں علامہ اقبال کے فکر ونظر کے موتی بکھرے پڑے ہیں یا وہ زیب آرائے شعر وغزل ہیں۔ انتساب کی ایک اور صورت ملاحظہ ہو:

عصری لغت کے مصنف بھی ایک قدآور ادیب ونقاد، منفرد طرز نگارش کے مالک اور بالخصوص اقبال شناسی کے شعبے میں یدطولیٰ ہی نہیں بڑے اعزاز واحترام کے حامل ہیں۔ میری مراد پروفیسر عبدالحق صاحب سے ہے۔ انھوں نے بعنوان انتساب بیٹیوں کو متعارف کیا ہے۔ لیکن بہ انداز دیگر وبہ الفاظ بہتر۔

باپ بیٹی کا رشتہ پاکیزہ، معصوم اور پیارا ہوتا ہے۔ یہاں جذبہ وخیال دریائے طہارت میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ ایسا کوئی لفظ کوئی ترکیب زبان وقلم سے ادا نہیں ہوتے جس سے اس کی تقدیس پامال ہوتی ہو۔ رشتوں کی تحریم وطہارت اور ان کی پاسداری ہمارے معاشرے میں ایک مستقل عنوان ہے۔ سب جانتے ہیں لفظوں میں بھی آبرو ہے، اعتبار ہے، اگر صحیح جگہ صحیح طور پر برتا جائے تو وہ قلم کی تہذیب وطہارت کے گواہ بنتے ہیں۔ پروفیسر عبدالحق صاحب بھی خیر سے چار لائق بیٹیوں کے فائق باپ ہیں انھوں نے بھی اپنی کتاب ''عصری لغت'' کا انتساب ان کی لیاقتوں کے نام کیا ہے۔ لیکن ان کے اظہار میں جو سلیقہ وشعور ہے۔ اسے سلامتی طبع، تہذیب مزاج اور صبر واستقامت کا نتیجہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

علامہ اقبال اپنے بلند وپاکیزہ خیال اور پیام خودی کے لیے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا نام آتے ہی ان کی پوری شاعرانہ فضا پردۂ ذہن پر ابھر آتی ہے۔ بچیوں کے ذکر کے ساتھ اقبال کے مصرعے کو وابستہ کرنا خواہ وہ کسی مفہوم میں ہو انھیں بلندیٔ خیال، پاکیزہ تصورات اور خودی کی شرافت وعظمت سے وابستہ رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ اب سادہ سادہ انتساب دیکھیے اور دو قدم میرے ساتھ چلنے کی بھی کوشش کیجئے لکھتے ہیں: صائمہ حق، ڈاکٹر شفا حق، ڈاکٹر سماء حق، سارا حق کے نام انتساب۔

کہ ہیں عزیز تر از جاں وجانِ جاں مجھکو

بظاہر یہ ایک اطلاعاتی بیانیہ ہے لیکن اپنی حقیقت میں ایک بھرپور تعارف ہے۔ جہاں تک مصرعۂ اقبال کا

تعلق ہے اس میں بھی کوئی پیغام چھوٹا یا بڑا موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی شے اس میں قاری کو متوجہ کرتی ہے تو وہ لفظِ ''ڈاکٹر'' ہے جو ہر بچے کے نام کا لاحقہ ہے اور شاید کہ یہی مقصود تحریر بھی ہو۔ یہ ان کی ذاتی لیاقت اور ان کے علمی تشخص کا تعارف ہے، اور یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کا مطالعاتی ذوق نئی آگاہیوں اور علمی کہکشاؤں کو اپنے آنچل میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کی ایک تعبیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے آپ میں حالات کی گتھیاں سلجھانے میں اہل بھی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کے یہ اوصاف نہ تو عارضی ہیں اور نہ زوال پذیر، بلکہ یہ مستقل ہیں اور روز افزوں مائل ترقی بھی۔ ''عصری لغت'' کے قارئین کا حلقہ محدود نہیں کہا جاسکتا اس تعارف کے، لائق بیٹیوں کے ذکر میں علامہ اقبال کے مصرعے کی قرأت کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق صاحب کے اندر فخر و مسرت کے فطری جذبات کی زیریں لہروں کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لیکن میری نظر میں ایک شفیق باپ کی حسرت و آس اور اس کی بیتاب آرزوئیں ہیں اور جن کے لیے ایک فقیر رہگذر کی صدا از فلک تا عرش دراز ہے۔

پروفیسر عبدالحق صاحب نے اپنے رشتے داروں، عزیز دوستوں، صاحبان اخلاص اساتذہ اور متعلقین سب کے نام کتابیں منسوب کی ہیں، اور ان کے ساتھ اپنے ذہن و دل کے رشتوں کی یاد دلائی ہے، تو ان کو بھی ''عصری لغت'' کی ممکنہ غرض و غایت سے جوڑ کر دیکھا جاسکتا ہے۔ ''عصری لغت'' کا یہ انتساب اپنے قاری سے تقاضا کرتا ہے کہ اولاد، خواہ بچیاں ہی کیوں نہ ہوں، انھیں اعلیٰ تعلیم، اچھی تربیت، پسندیدہ اخلاق اور شائستہ خصائل سے آراستہ کیا جائے۔ معزز مقام دلایا جائے۔ دوسری جانب یہ اپنے معاشرے سے بھی سوال کرتا ہے۔ کیا ایسا کرنا بہتر نہیں ہے، کیا وقت کے مطالبے کی طرف سے آنکھیں موند لینا سمجھداری ہے؟ شاید نہیں۔ بلکہ شاید یہی طریقہ ہے اندھیرے سے اُجالے کی طرف کے سفر کا ہے۔ یہ ایسے انتساب کی مثال ہے جو اپنے اندر متعدد پہلو رکھتا ہو۔ افراد سے قطع نظر انتساب کی ایک توسیعی تصویر پروفیسر عبدالحق کی تازہ تصنیف ملاحظہ ہو

''اقبال کے دینی تصورات'' ''جائے پیدائش و پرورش، پہاڑ پور گاؤں کے نام، جہاں والدین آسودۂ خاک ہیں

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی''

اس انتساب میں دو وجدانی کیفیات یا جذبات کی دو جداگانہ صورتیں جو ایک دوسرے میں مدغم و پیوست ہوگئی ہیں۔ اور اب انھیں الگ کوئی نام و پہچان دینا مشکل ہوگیا ہے ان میں سے ایک تو حب وطن ہے اور دوسری والدین کی عظمت و محبت بظاہر مصرعۂ اقبال نے والدین سے اظہار عقیدت و محبت کو شدید تر یا فزوں تر کیا ہے لیکن بات اس طرح پر نہیں ہے۔ آپ ظاہر الفاظ پر نہ جائیے۔ معنوی گہرائی میں اُتریئے۔ شعراء تو ویسے ہی دور کی کوڑی لانے کے لیے مشہور ہیں اور پھر اقبال تو ایک بڑے مفکر بھی ہیں۔ لفظوں میں فلسفیانہ تہہ داری ہوتی ہے۔ دوسرے پروفیسر

عبدالحق بھی اردو کے باریک نظر استاد ورمز شناس اقبالی ہیں۔ظاہراًان کے یہ انتسابی جملے اور اقبال کے مصرعے میں خیال کی چول سے چول نہیں بیٹھتی۔لیکن پھر سے غور کیجئے۔میں سمجھتا ہوں وہ جنت آشیاں والدین جو اسی گاؤں میں آسودۂ خاک ہیں۔اب گاؤں کی مٹی کی مہک اوران کے لاڈ پیار کی خوشبو آپس میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔اب خاک وطن کی زیارت ہی لحدِ آباء کی زیارت ہے۔یا جسے لحد آباء کی زیارت کہئے وہ خاکِ وطن ہی کی زیات ہے۔میرے خیال میں اس انتساب کی بنا یادایام ماضی ہوسکتی ہے۔اسی کی کسک نے گاؤں کے نام یادگار انتساب لکھوایا ہے دیکھئے آپ گھر دروازے کا ذکر وہ کس چاہت سے کرتے ہیں ان ہی کی زبان سے سنئے۔

''وہ نائب تحصیلداری کا امتحان ہوتا ہے، میرا اس میں نام آ گیا والدہ بہت خوش تھیں کہ بیٹا ہمارا نائب تحصیلدار بن جائے گا۔اور ظاہر ہے یہ اس زمانے کا ایک بڑا منصب تھا لیکن والد صاحب کو ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔چاہے تم نائب تحصیلدار بن جاؤ چاہے تم قانون گو ہو جاؤ۔ان کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔والد صاحب کا مزاج قلندرانہ تھا۔وہ ہمیشہ یہی کہتے۔یہ سب کیا ہے میاں کھانے پینے کو اللہ دے رہا۔اور کیا چاہئے۔بس دو کرتا دو پائجامہ دو لنگی زندگی گزارنے کے لیے کافی ہے اور کچھ سامان ہو جائے کھانے پینے کا۔یہ بھینس پلی ہے، دودھ دہی مل رہے ہیں۔دو چار بکریاں پلی ہوئی ہیں ان سے جو خصی ملتا ہے بقرہ عید میں کام آ جاتا ہے گوشت مل جاتا ہے۔بھینس دودھ دینا بند کر دے تو چائے کے لیے بکریوں کا دودھ ہے۔اور یہ مرغیاں ہیں چر جگ رہی ہیں۔یہی ہماری میراث ہے۔اور یہی حال پوری بستی کا تھا۔دہلی آ جانے کے بعد بھی وہ یہی کہتے رہے یہ کیا میاں آنا جانا لگائے ہو۔آؤ یہیں رہو گھر کو سنبھالو، کھانے پینے کو اللہ دے رہا ہے۔اتنی زمین ہے باغ ہے انھیں دیکھو بہر حال مجھے ان کی یہ قلندری بھی سکندری سے کم نہ تھی۔میں دہلی آیا تو یقین مانئے مجھے ان کی رفاقت کا اوران سے دوری کا بڑا احساس ہوتا تھا خاص طور سے والدہ کا۔''

(پروفیسر عبدالحق۔روبرو، ریختہ. ڈاٹ کام)

یاد ایام سلف ! تو نے مجھے تڑپادیا
آہ اے چشم تصور تو نے کیا دکھلادیا

اے فراق رفتگاں ! تونے کیا سمجھا دیا
درد پنہاں کی خلش کو اور بھی چمکا دیا

(علامہ اقبال۔بحوالہ:اقبال کے دینی تصورات،ص۔۷۷)

پوری دونسل کا طویل ثقافتی منظر وپس منظر اور انتساب کے یہ محض دو جملے اسی میں درمیان کے جملہ نشیب وفراز کی تفصیل سمودی گئی۔اگر ایجاز نگاری اور اختصاری بیانی ادب میں کوئی چیز ہے تو پروفیسر عبدالحق قابل داد وتحسین ہیں۔

اس تازہ وارد کتاب میں بھی فکر ونظر کے سنجیدہ مضامین ہیں۔دین ودانش کے گہرے افکار ومباحث ہیں اور ہر خیال کو تحقیق کی آزمائش گاہ تک پہنچایا گیا ہے۔آفاق وآثار میں دانش وحکمت کی بیکراں اشارات پوشیدہ ہیں۔ان کی تلاش وجستجو میں بڑی وقت نظر سے کام لیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اقبال کی فکری کائنات ان ہی اشارات وغوامض کی زرف بینی اور ان کی تفہیمی گہرائیوں سے عبارت ہے۔خود اقبال کو بھی اس کا اعتراف ہے وہ آنحضور کی جناب میں اخلاص وعقیدت اس طرح پیش کرتے ہیں۔

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پرودۂ احسانِ تست

آنحضرتؐ کی ذاتِ پاکیزہ صفات مرکز تجلیات ہے اور اقبال کے ایقان وعرفان کا محور بھی وہی ذات ہدایت مآب ہے عشق مصطفیٰ کو وہ تسخیر کل کا سرمایہ راز مانتے ہیں۔

عاشقی محکم شود از تقلید یار
تا کمند تو شود یزداں سکار

اقبال کے فکر وفلسفہ کا خمیر اسلام اور پیغمبر اسلام کے فیضان نعمت سے اٹھا ہے۔اشارات سماوی بیکراں ہیں اور الطاف مصطفائی بھی بے شمار ہیں۔تحقیق کے مراحل سخت اور جاں گسل ہیں ان سب کے باوجود پروفیسر عبدالحق نے اس کا حق ادا کرنے کی اچھی کوشش کی ہے مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اقبال کے نظام فکر کا مبداء ومصدر فلسفۂ خودی ہے اور نور خودی کا منبع نور

خداوندی ہے جو زمین وآسمان کا نور ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ خداوند نے
اپنے لیے لیس کمثلہٖ شئی بھی کہا ہے۔''

اس کتاب کے عناوین جس کے جائزے سے پوری کتاب بیک نگاہ سامنے آجائے گی اس طرح ہیں:۔(۱) فکرِ اقبال کا امتیاز، (۲) آیۂ نور اور اقبال، (۳) حدیث رسول اور شعر اقبال، (۴) معراج رسول فکر اقبال کا محرک تخلیق، (۵) ذکر رسول :فکر اقبال کا نکتۂ آغاز، (۶) اقبال کا تصور مملکت وامارت، (۷) فکر اقبال کے عصری حوالے، (۸) اقبال کا تصور جہاد، (۹) اقبال اور مقام شبیریؓ، (۱۰) اقبال اور تصوف، (۱۱) مسجد قرطبہ کا پس منظر

ہر عنوان کے ذیل میں اقبال کی فکر ونظر کے حامل وترجمان ان کے اشعار اور نثری تحریر کے نمونے پیش کیے گئے ہیں اور ایسی تمام آیات ربانی کی تخریج کی گئی ہے جن سے ان کے مضامین کی تائید نکلتی ہے اور اسی طرح پر وہ تمام ارشادات نبوی بھی تلاش کیے گئے ہیں جو اس مضمون کی صحت پر دال ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک بڑا اور دقیق کام تھا جس کو اللہ تعالیٰ کی مشیت نے پروفیسر عبدالحق کے ہاتھ سے پورا کرایا۔ یہ بس ''تا نہ بخشد خدائے بخشندہ'' کا مضمون ہے۔

بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میرا مقصد کتاب کا تعارف یا تبصرہ نہیں ہے بلکہ انتساب کے فن پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ پروفیسر عبدالحق نے اس فن کے برتنے میں کمال مہارت وچابکدستی سے کام لیا ہے۔ضروری نہیں ہے کہ انتساب اپنی کتاب کے موضوع ومبحث سے متعلق ہی ہو، یا اس فن کی کسی معروف ومعتبر شخصیت کے نام پر ہو۔ یہ مصنف کا اپنا حق ہے جسے چاہے منتخب کرسکتا ہے۔ یہ دراصل اعتراف اپنائیت محبّ کا ایک بے داغ وسیلہ ہے۔ایک ایسا راز جسے سینے میں دبائے رکھا گیا تھا اور اب اسے عیاں کرنا چاہا گیا ہے، انتساب کا دامن اس کے لیے سب محفوظ ومناسب جائے اظہار ہے یہاں مستور سچائی کا بھی کھلا اعتراف ہوسکتا ہے۔ گاؤں چھوڑتے ہوئے بھی انھیں ۳۰ سال ہو رہے ہونگے مگر اس کے باوجود اس کی یاد ہے کہ دل سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی اس نے تو گویا جگر وجہاں میں گھر کیے رکھا ہے۔خواب ہیں تو ہیں بھی وہی باغ، ساون کے جھولے، کنویں کی جگ اور گاؤں کی چوپال ہے۔ غالباً اسی خلشِ جاں کی آسودگی کے لیے انھوں نے اس وقیع کتاب کو اپنی جائے پیدائش وپرورش کی محبتوں کے نام کیا ہے اور اپنے جذبۂ وطنیت کو پائندگی عطا کی اور اسے یادگار بنایا ہے۔اس خوبصورت انتساب کو علامہ اقبال کے فلسفیانہ فکر کی جو پشت پناہی ان کے مصرعے سے مل رہی ہے وہی اس انتساب کے حسن کی اساسِ تکوینی ہے ۔ان باتوں کے عرض کرنے سے میری مراد علامہ اقبال کے فکر کی پہنائیاں کہاں تک دراز ہیں اور اس کے حدود کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں اس کا صحیح اندازہ لگانے کی احتیاج پر مزید توجہ دلانا ہے۔ **''معروضات ومطالعات''** کا انتساب

بھی اسی طرح کا ایک مہر بند انتساب ہے لیکن اگر شعور ونظر کی فعالیت قائم رہتی ہے اور ارادے کو اس کا ساتھ ملتا ہے تو امید ہے انشاءاللہ اس کے بھی حرف راز تک رسائی ملے گی۔ یہ کتاب ''علم واخلاص کی علامت ڈاکٹر ناظرہ محمود کے نام منسوب ہے۔

تری نواؤں سے ہے پیکر گل تابناک''

یہاں علم اور اخلاص دو بنیادی لفظ ہیں جن کے اوپر اس انتساب کی پوری عمارت ٹکی ہوئی ہے۔ اور ہم انھیں کے لوازمات ومؤثرات پر غور کرنا چاہیں گے۔

علم کس شے کا نام ہے؟ اس سوال پر تمام علماء علام متفق ہیں کہ علم دراصل نور ہے، تجلی ہے، اہل لغات بھی اس کے معنی عرفان وآگہی اور تاڑ لینے کی صلاحیت بتاتے ہیں۔ علم ہی عقل وشعور کا رہنما اور وزیر ومشیر ہے۔ اگر فیضان علم وآگہی عقل وشعور میں پیوست ہوں تو عادات واخلاق سے شرافت وکرامت کے رنگ بکھرتے ہیں۔ گفتگو میں متانت ولطافت کے قند گھلتے ہیں۔ مباحث میں اشاراتِ زندگی ملتے ہیں۔ مسائل کی گتھیاں سلجھتی ہیں۔ علم وعرفان کی بیشمار برکتوں میں سے ایک برکت یہ بھی ہے کہ شخصیت میں وقار آتا ہے اور مقناطیسیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ علامتیں ہیں جن کے ظہور سے فکر کے فانوس میں شمعِ علم روشن ہونے کا سراغ وادراک ملتا ہے۔

اسی طرح اخلاص بھی ایک قلبی کیفیت ہے جو آدمی کو متواضع اور بے غرض بناتی ہے۔ لغات کی رو سے یہ لفظ پاک، صاف اور محبت کے معنی دیتا ہے۔ دل میں اخلاص ومحبت کی آگ ہو تو اس کی سورش وتپش اور گرمی سے ذاتی ونفسی اندھیرے پگھل کر فنا ہو جاتے ہیں۔ دل اور اس کی ہر تمنا پاک ومنزہ ہوتی ہے۔ محبت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ ہمہ وقت مضطرب وبیچین کیے رکھتی ہے۔ نتیجے میں شخصیت سراپا دلسوزی وہمدردی کا متحرک پیکر بنتی ہے۔ ان ہی علامتوں سے پتہ چلتا ہے کہ دل میں آتشِ اخلاص ومحبت روشن ہے۔

جب ڈاکٹر ناظرہ محمود صاحبہ کو علم واخلاص کی علامت کہا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ساری خوبیاں موصوفہ کے اخلاق وعمل میں جلوہ گر ہیں۔ سمجھنے کی ایک اور بات یہ بھی ہے کہ ہر لفظ کی پشت پر اس کے لغوی معنی کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہوتی ہے جس کو تاثر یا تاثیر کہتے ہیں اور یہی وہ شے ہے جو تصور وتخیل کو متحرک کرتی ہے جب کوئی لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے متعلق جتنی چیزیں ہمارے علم وحافظہ میں پڑی ہیں وہ ان سب کو متحرک کر دیتا ہے اور ساری یادداشتیں بطور مجموعی پردۂ احساس پر عود کر آتی ہیں۔

مثلاً جب کوئی آم، کہتا ہے تو آم کے پھلوں کی تازگی، ان کی ہری پیلی لال خیری رنگت، ترش وشیریں مہک اور کھٹی میٹھی لذت سب مل کر قوت احساس کو متحرک وفعال کر دیتے ہیں۔ ورنہ سوچئے کھٹے آم، لیموں یا املی کا نام سنتے

ہی منہ میں پانی کیوں آتا ہے۔ یا کسی گندی شے کا محض نام سن لینے سے طبعیت میں کراہیت اور گھن کیوں پیدا ہوتی ہے؟ وجہ وہی ہے جو عرض کی گئی۔ جاننے والوں کے سامنے جب ''ڈاکٹر ناظرہ محمود'' کہا جائے گا تو موصوفہ سے متعلق جملہ خوبیاں جن کا ذکر ابھی ہوا، اور موصوفہ جن کا جیتا جاگتا پیکر ہوں گی۔ سب کی سب شیشۂ فکر پر مرتسم اور عکس بند ہو جائیں گی۔ یا دوسرے لفظوں میں جب مذکورہ اوصاف حمیدہ بطور تشخص یا علامت بیاں ہوں گے 'ڈاکٹر ناظرہ محمود' صاحبہ کی شخصیت نگاہوں میں از خود تیر جائے گی۔ اس انتساب کے اندر ایک اور لفظ بھی آیا ہے۔ اور وہ ہے 'علامت' اور اس علامت نے گو گویا قیامت ہی کر دیا دونوں کو لازم وملزوم بنا دیا اور صحیح بھی یہی ہے کہ صفت وموصوف کبھی منفک نہیں ہوتے، اب حالت یہ ہے کہ جہاں یہ (اوصاف) ہوں گے وہ بھی آئیں گی اور جہاں وہ ہوں گی یہ بھی رہیں گے۔

دیکھا آپ نے، یہ کرشمہ ہے عبورِ کامل کا، جو بیان کے علم پر پروفیسر عبدالحق کو حاصل ہے، کہ محض دو لفظ بول کر ایک پوری شخصیت کا نقشہ کھینچ دیا، جو بہر طور شگفتہ مزاج، پاکیزہ خصال، متحرک وفعال اور ہر طرح کے صلہ وستائش کی تمنا سے بے نیاز مقصد ہے۔

ان وضاحتوں سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اختصار وایجاز انتساب کے فن کا مطلوب لازمہ ہے۔ اس انتساب میں اقبال کا جو مصرعہ استعمال ہوا ہے البتہ وہ چونکاتا ہے۔ بہر حال علامہ اقبال ایک بلند خیال ومفکر شاعر ہیں۔ ان کی پراسرار اشاریت کو سمجھنا آسان نہیں۔ اور کبھی کبھی تو متاع نظر کو ان کی سجھائی ہوئی ممکنہ راہوں میں قدم رکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ خیر یہ کیفیت نظر کا معاملہ ہے۔ اس کو یہیں چھوڑیئے۔

آیئے اب ایک ایسی جانب رخ کرتے جس میں تالیف وتصنیف کی دنیا تو مختصر ہے لیکن وہاں علاج وشفا، زندہ دلی اور داد ودہش کی ایک متعارف دنیا ضرور ہے۔ اور وہ ہے روتے ہوؤں کو ہنسا دینے والی ذات ڈاکٹر عبدالسلام جونپوری۔ کتاب خواہ کسی کے نام معنون ہو، اس کے ساتھ تعلقات، اس کی بنا ونوعیت وغیرہ کی تفصیل انتساب میں نہیں ہوتی۔ انتساب کا مزاج زیادہ تفصیل کا متحمل نہیں ہے۔ یہ تو سمندر کو کوزے میں سمونے کا فن ہے۔ اور پروفیسر عبدالحق اس میں بھی خوب داد ہنر دیتے ہیں۔ اگر ان کا طریقۂ کار دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ الفاظ تو بہت ہی کم صرف کرتے ہیں مگر اس میں اشارے، خاص طور سے ایسا اشارہ اس میں ضرور رکھ چھوڑتے ہیں جو ان کے رشتۂ اخلاص ووفا کا عنوان ثابت ہو۔ اور آخر میں اقبال کا کوئی کھنکتا ہوا مصرع اچھال دیتے ہیں اور قاری متحیر رہ جاتا ہے۔

انتساب دراصل اخلاص، اعتراف اور محبت ووفا کے روشن چراغ ہیں جو کتابوں کے فانوس میں رکھے جاتے ہیں اور پروفیسر عبدالحق اس کام کو بڑے خلوص وانہماک سے کرتے آئے ہیں۔ 1989ء میں شائع ہوئی اپنی کتاب ''

اقبال کے شعری اسالیب'' کو دیکھئے کس خلوص خالص کے ساتھ وہ اپنے ایک دم ساز وہمراز کی نذر کرتے ہیں۔

''برادر محترم ڈاکٹر عبدالسلام کی نذر۔

تیرے نفس کی موج سے نشو ونمائے آرزو''

ڈاکٹر عبدالسلام (وفات ۲۴/اکتوبر ۲۰۱۹ء) جونپور کے مشہور معالج تھے سبزی بازار میں مطب تھا اور ہے۔ انھیں دارالعلوم ندوہ لکھنؤ سے علم دین واصول زندگی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے علم طب وطریقۂ علاج کی سند حاصل تھی۔ اللہ نے دست شفا کی نعمت سے نوازا تھا۔ دوائیں کم، معتبر اور سستی لکھتے تھے بیماروں کی بھیڑ لگی رہتی۔ حافظہ اچھا تھا۔ جس کی نبض ایک بار دیکھ لیتے پوری کیفیت ذہن میں محفوظ ہو جاتی۔

ادھر حال کے دنوں میں 'ماہنامہ اردو دنیا' دہلی، ۔ ماہ مارچ ۲۰۲۳/ کا شمارہ ملا۔ یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ پروفیسر عبدالحق کا ایک مضمون ''جونپور کی تین معاصر محترم شخصیتیں اس کے صفات کی زینت ہے۔ اس میں ڈاکٹر عبدالسلام مرحوم کو وہ اپنا رفیق وہم راز بتاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اور اہم معلومات بھی اس میں ہیں۔ وہ ۱۹۷۷ء میں والدہ کے علاج کے سلسلے میں پہلی بار ان سے ملے تھے اور جلد ہی ''ہم مشرب وہم راز'' اور ''خلوت وجلوت کے ہم نشیں'' بن گئے۔ انھوں نے سلسلۂ واقعات لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ ''میری شادی میں ایک مؤثر محرک وہ بھی تھے۔''

ان کے اس انکشاف سے معاملہ تھوڑا سا قریب فہم آ گیا ہے۔ اب قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انتساب میں اس مصرعے کو دراصل کیوں لایا گیا ہے۔ اور اس میں کیا کیا نہ کہنا چاہا گیا ہے ع

''تیرے نفس کی موج سے نشو ونمائے آرزو''

اپنے مطبوعہ مضمون میں ڈاکٹر مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ تو انھوں نے مصرعے کے دوسرے ٹکڑے ''نشو ونمائے آرزو'' میں 'آرزو' کو ''زندگی'' سے بدل کر ایک خوبصورت موڑ پیدا کیا اور ایک بلیغ اشارہ کیا ہے۔ شاعری دل کی زبان ہے۔ اشاروں میں بات کرتی ہے۔ ذہن میں اس حقیقت کو رکھ کر ہی اس انتساب کو سمجھا جانا چاہئے۔ اس بات میں تو شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے کہ اس فضائے جمیل وجمال کو جس میں 'آرزو' اور 'زندگی' دونوں ہی کو بیک وقت ''نشو ونما'' ملتی ہو، کوئی مسیحا نفس ہی ہموار کرتا ہے۔ مصرع کا کوئی متعین معنی نہیں ہو سکتا۔ اور پھر علامہ اقبال کے یہاں تو بڑی رمزیت پائی جاتی ہے۔ پروفیسر عبدالحق بھی زیادہ تر کنایہ کی زبان میں ہی کلام کرتے ہیں۔ مصرعے کے معنی ومفہوم ہمیشہ اپنے سیاق وسباق کے تابع ہوتے ہیں اور پروفیسر عبدالحق نئے نئے سیاق وسبق کے تناظر میں مصرعوں کو آزمانے کا ہنر خوب جانتے ہیں اشاریت، رمزیت، وکنایت نہ صرف اردو زبان کو خوبصورتی بلکہ تہذیب کی شائستگی بھی ہے اور انتساب کے فن کا حسن بھی۔

اقبال کے دینی تصورات

(چند مباحث)

صفحات : ۲۰۰

قیمت : تین سو روپیے

ناشر : عذرا بک ٹریڈرس دریا گنج، نئی دہلی

مبصر : ڈاکٹر اقبال قریشی۔ اسلامک یونی ورسٹی آف سائنس وٹکنالوجی، سری نگر

پروفیسر عبدالحق کی یہ تصنیف دینِ مبین سے متعلق علامہ اقبال کے چند تصورات پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ کئی دو پر ایک آتے ہیں زیادہ تر حالیہ برسوں میں رقم کیے گئے ہیں جیسے 'حدیثِ رسولؐ اور شعرِ اقبال' اور 'شعرِ اقبال'، 'معراجِ رسولؐ'، 'فکر اقبال کے عصرے حوالے'، 'اقبال کا تصورِ جہاد'، 'اقبال اور تصوف' وغیرہ آیۂ نور اور اقبال اور اقبال اور مقامِ شبیریؓ بہت پہلے لکھے گئے تھے۔

اس کتاب سے پروفیسر موصوف کے دینی شغف اور اندازِ نظر کا احساس ہوتا ہے جو اقبال فہمی کا حاصل ہے اور معاون بھی۔ ویسے بھی انہوں نے اپنے مطالعہ میں دین کی حرمت وعظمت کا ہمیشہ پاس رکھا ہے۔ دین سے تخلیق وتحریر کی نسبت قائم کرنے میں ان کی بے مثل کاوش قابلِ تحسین ہے۔ ان کے اس جذبے کو آفریں ہو کہ انہوں نے ہر تحریر میں شعارِ دین کی برگزیدگی کو برقرار رکھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تصانیف اس کی تازہ مثال زیرِ تبصرہ کتاب ہے۔ علامہ کے چند موضوعات کو جس احترام اور سنجیدگی سے زیرِ نظر یا گیا ہے وہ اقبالیاتی مطالعہ اور کے بہت ہی فکر افروز مباحث ہیں۔ ان میں فکر انگیز نکات ہیں اور کئی خیال افروز پہلو ایسے ہیں جن پر بہت کم توجہ دی گئی تھی۔ پروفیسر عبدالحق نے اقبال کے فکرِ دینی کے چند اشارات کو قلم بند کر کے مطالعۂ اقبال کی وسعتوں اور امکانانی پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ حدیثِ رسولؐ اور معراجِ رسولؐ کو فکر اقبال کا محرکِ تخلیق قرار دینے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اسی طرح ذکرِ رسولؐ کو فکرِ اقبال کا نقطۂ آغاز اقبالیاتی مطالعہ کے محور کو نئی حقیقت سے روشناس کرتا ہے۔ اسی طرح مملکت وامارت، آیۂ نور وغیرہ مباحث بہت ہی غور طلب ہیں۔ ان تصورات کی نشان دہی سے اقبال شناسی کی نئی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ ان موضوعات کے تجزیہ سے مصنف کے مطالعہ کا احساس ہوتا ہے۔ جن میں برسوں کا انہماک اور ادراک شامل ہے۔ شعر وادب کی تفہیم میں فکرِ دین کے یقین وثبات کا امتزاج ہمارے انتقادی ادب میں دانشِ نورانی کی ایک خوش گوار علامت ہے۔ کتاب کی طباعت واشاعت کا اہتمام بھی رشک آفریں ہے۔ پبلشر بھی قابلِ مبارک باد ہے۔

نام کتاب: دبستانِ نعت

مدیر: ڈاکٹر سراج احمد قادری بستی (یوپی)

صفحات: 520

ہدیہ: 500روپے

تعداد: 500

شمارہ: 7/2022-23ء

مبصر: حافظ محمد اختر

ڈاکٹر سراج احمد قادری علم وعمل سے مرکب اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ سرکاری ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیتے ہوئے رہبرِ اعظمؐ کے پیام ہدایت ونصرت کی اشاعت میں ایک قابلِ رشک فرزانے کی طرح گامزن ہیں۔ 'دبستانِ نعت' کا ساتواں شمارہ زیرِنظر ہے۔ حضور رسالتِ مآبؐ کی مقدس ذات وصفات سے متعلق مقالات اور شعری تخلیقات کا بڑا گراں قدر مجموعہ ہے۔ جو ہر اعتبار سے محبت وعقیدت کی نورفشانی سے معمور ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عصرِ حاضر کے ذی فکر اصحاب قلم کی کاوشوں کا ایک کشکول ہے۔ جس میں معراجِ رسولؐ ،نعت کا حسنِ بیانیہ، عہدِ رسالتؐ کے چند نعت گو شعراء آذربائیجان کا قدآور خاقانی، نعت گوئی روایت اور فنی ارتقاء وغیرہ بہت سے مضامین وقیع اور اہم ہیں۔ بیش از بیش مضامین نور ونظر کو روشنی بخشتے ہیں اور قلب کو راحت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ چھ صفحے پر مشتمل مدیر محترم کا اداریہ فکر انگیز اور مطالعہ میں نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے رسالہ کے نصب العین کا اشاریہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

زاویۂ نگاہ میں دبستان نعت کے پچھلے شمارہ نمبر ۶ پر تبصرہ بھی خاصے کی چیز ہے کوتاہیوں کی گرفت ایک صحت منداور منصفانہ تحریر ہے۔ یہ احتساب ایک علمی بحث کا تقاضا کرتا ہے۔ دوسری آرا بھی غور وطلب ہیں۔ منظوم تخلیقات کا صفحہ آخر میں درج ہے۔ اس میں گزرے ہوئے شعراء کا کلام بھی شامل ہے۔ حالاں کہ ان کی اشاعت کا سبب معلوم نہ ہوسکا۔ چند ستائشی اور تاثراتی خطوط بھی درج کیے گئے ہیں جن سے قارئین کے نقد ونظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حافظ محمد اختر
امام بلال مسجد، دہلی۔۷

مخدوم محی الدین

اقبال کی رحلت پر

جس رہ نوردِ شوق کو منزل سے عار تھا
جس موجِ بے قرار کو ساحل سے عار تھا
کس کی نظر نے اس کو نظر بند کردیا؟
اس برقِ جاں نواز کو پابند کردیا؟
شعلہ زمیں کا عرش کی گودی میں سوگیا
امّت کا شب چراغ اندھیرے میں کھو گیا